ISSN - 2582 - 3612

سہ ماہی ساغرِ ادب مظفرپور

پیئر ریویوڈ اردو جرنل

(اپریل تا جون ۲۰۲۱ء)

مدیر (اعزازی)

پروفیسر سید آل ظفر

ساغرِ ادب April to June 2021 Vol. : 03, Issue : 9 مدیر (اعزازی): پروفیسر (ڈاکٹر) سید آل ظفر

ترتیب

نمبر شمار	رشحات قلم	ارباب قلم	صفحہ نمبر
۱	اداریہ	پروفیسر سیّد آل ظفر	۶
۲	حمد باری تعالیٰ	تنویر پھول (امریکہ)	۱۱
۳	نعت پاک	پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی	۱۲
۴	مشتاق احمد وانی: زندگی کی صداقتوں کا ادیب	پروفیسر قدوس جاوید	۱۳
۵	نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے اردو زباں والو	پروفیسر عبدالواسع	۲۴
۶	ذوقی کے اہم ناول ''آتش رفتہ'' کا سراغ۔۔۔	پروفیسر محمد کاظم	۲۹
۷	ن۔م۔راشد کے تعلق سے چند باتیں	ڈاکٹر جمال اُویسی	۴۰
۸	پروفیسر مولا بخش: شخصیت اور کارنامے	ڈاکٹر سرور ساجد	۴۶
۹	ناول ''زندہ محاورے'' کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر محمد صادق حسین	۵۲
۱۰	حقانی القاسمی نے حق دوستی ادا کیا	ڈاکٹر سیفی سرونجی	۵۶
۱۱	سیّد احمد قادری کے افسانے: حیات وکائنات کا نوحہ	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	۶۱
۱۲	ڈاکٹر ممتاز احمد خاں: مرنے والا تجھے روئے گا زمانہ برسوں	انوار الحسن وسطوی	۶۹
۱۳	بلند پایہ علمی وادبی شخصیت۔ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی	حلیم صابر	۷۷
۱۴	اردو صحافت: ایک جائزہ	ڈاکٹر گل افشاں شمیم	۸۱
۱۵	سجاد ظہیر اور اردو افسانہ نگاری	ڈاکٹر محمد تنویر اختر نور	۸۵
۱۶	عابد سہیل کے ادبی جہات	ڈاکٹر محمد مطیع الرحمٰن	۸۹
۱۷	میرے ناولوں کی گمشدہ آواز: ایک توضیحی مطالعہ	ڈاکٹر مستفیض احد عارفی	۹۷
۱۸	رضا نقوی واہی کی مزاح نگاری	ڈاکٹر وصی احمد شمشاد	۱۰۳
۱۹	احمد سجاد کی تنقید نگاری	محمد ضیاء الحق	۱۰۷
۲۰	انتظار حسین کے افسانے اور اساطیری جمالیات	ڈاکٹر محمد فہیم ربانی	۱۱۱
۲۱	احساس وآہنگ کا شاعر: اشرف یعقوبی	انور بارہ بنکوی	۱۱۵
۲۲	فرقہ وارانہ فسادات کا ترجمان ناول ''آنکھ جو سوچتی ہے''	ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن	۱۲۳

ISSN : 2582 - 3612

سہ ماہی

ساغرِ اَدب

مظفر پور

(پیئر ریویوڈ اُردو جرنل)

اپریل تا جون ۲۰۲۱ء

مُدیر (اعزازی)

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

پروفیسر

پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اُردو

بی۔آر۔اے۔بہار یونیورسٹی، مظفر پور

بہار (انڈیا)

ISSN : 2582 - 3612

۲۳	داستانِ مہر افروز دلبر اور دہلوی معاشرت	ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ حبان الحق	۱۲۷
۲۴	کلیم عاجز کی شاعری۔ ایک جائزہ	ڈاکٹر مرزا صبا عالم بیگ	۱۳۱
۲۵	شموئل احمد کا ناول ''ندی'' فن کے آئینے میں	ڈاکٹر نسرین بانو	۱۳۴
۲۶	تنقید، اس کی ماہیت، اہمیت اور افادیت	ڈاکٹر اعجاز کاظمی	۱۳۹
۲۷	اردو فکشن میں ہندوستانیت	ڈاکٹر امتیاز عالم	۱۴۴
۲۸	شمین مظفر پوری کی ناول نگاری	ڈاکٹر تبسم جہاں	۱۴۸

﴿گوشۂ ریسرچ اسکالرس﴾

۲۹	افسانے کی صنفی خصوصیات: ایک جائزہ	محمد شمیم عالم	۱۵۴
۳۰	''ملاقاتیں'': ایک جائزہ	عرفان اللہ خان	۱۶۰
۳۱	جموں و کشمیر میں اردو شاعری۔ ایک مطالعہ	زمرودہ محمد میر	۱۶۹
۳۲	اکیسویں صدی کے معتبر ناول نگار	نکہت پروین	۱۷۸
۳۳	پروفیسر علیم اللہ حالی کی صحافتی خدمات: ایک جائزہ	رابعہ خاتون	۱۸۳
۳۴	غزل کا باوقار شاعر: طارق جمیلی	گل شمع آرا	۱۹۰
۳۵	ولی دکنی کی شاعرانہ عظمت	امام الدین امام	۱۹۴
۳۶	''ساغرِ ادب'' کا آٹھواں شمارہ (آپ کی نظر میں)	....	۲۰۲

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی

سیّد احمد قادری کے افسانے: حیات و کائنات کا نوحہ

کہانی سننے، کہانی پڑھنے اور کہانی کہنے کا رواج انسانی شعور وفہم کے ساتھ چلا آرہا ہے لیکن ہر عہد میں وہی کہانی سنی اور پڑھی جاتی ہے جو کیف وسرور اور انبساط وشادمانی کے جذبے سے قاری وسامع کو ہمکنار کرتی ہے۔ اس کے لئے کسی عمر اور معیار کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ بچے بھی ان کہانیوں سے اکتا کر نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں جو انہیں دلچسپ نہیں محسوس ہوتیں۔ اسی طرح بڑے بھی ایسی کہانیوں کو پڑھنے سے کتراتے ہیں جو ان کی حس اور ان کے شعور کو بیدار نہیں کر پاتی ہیں۔ گویا کہانی کے لئے پہلی شرط یہ ٹھہرتی ہے کہ وہ دلچسپ ہو اور انفراح وانشراح کی کیفیت سے ہمیں دوچار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ مزید یہ کہ دل ودماغ دونوں میں ارتعاش واضطراب بھی پیدا کر سکے۔ رومانی دور سے لے کر حقیقت پسندی تک، ترقی پسندی کے رجحانات سے لے کر جدیدیت تک، علامت نگاری سے تجریدیت تک، مابعد جدید اور ماضی کی بازیافت جیسے میلانات سے الگ ہٹ کر کہانی کو سمجھنے اور پرکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ رجحانات ومیلانات کے فکری ونظری جائزے ثانوی اہمیت رکھتے ہیں۔ دراصل دیکھنا یہ ہے کہ کہانی کارنے کہانی کا ٹریٹمنٹ کس زاویے سے کیا ہے اور اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔

قصہ گوئی کے ابتدائی ایام میں بالعموم اس پہلو پر زور دیا جاتا رہا ہے کہ گہوارۂ تہذیب میں قدم رکھنے کے بعد انسان کو جن تصادمات وحادثات اور امتحانات وخطرات کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کے نتیجے میں کہانی گڑھنے، بنانے یا بیان کرنے کا جذبہ/ مادّہ از خود بیدار ہو سکے۔ خاص طور پر اس نکتے پر زیادہ باتیں ہوئیں کہ دن بھر کی کڑی دھوپ اور محنت ومشقت سے گزرنے کے بعد اعصابی، جسمانی اور ذہنی طور پر تسکین یا فرحت حاصل کرنے کے لئے قدیم دور کے باسی رات کو الاؤ کے گرد جمع ہوتے اور ان مصروفیات، مہمات اور تجربات کے بارے میں باہم تبادلۂ خیالات کرتے۔ ان کے اسی طرزِ عمل نے آگے چل کر باقاعدہ کہانی سنانے کے جذبے کو مہمیز لگایا۔ ہر چند اس میں مزید اضافے کی ضرورت ہے تاکہ مختلف ادوار سے وابستہ قصوں کہانیوں کے مطالعہ سے انسان کے عہد بہ عہد بدلتے ہوئے زاویۂ نگاہ کو پرکھنے اور سمجھنے میں ہمیں خاطر خواہ مدد حاصل ہو۔

ISSN : 2582 - 3612

اس گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ ہم جس روایت سے جڑے ہوئے ہیں اور ہماری کہانی کی تار و پود کی جڑیں جہاں پیوست ہیں، اس میں کہانی کتنی ہی نئی کیوں نہ ہو، وہ کہانی پن سے کلیتاً دامن نہیں چھڑا سکتی ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجاد، جوگندر پال، شفیع جاوید، خالدہ اصغر، انیس رفیع، شوکت حیات، شموئل احمد، سیّد محمد اشرف، سیّد احمد قادری، سلام بن رزّاق، طارق چھتاری وغیرہ کی کہانیوں میں یہ خوبی ملے گی کہ کہانی میں اظہار کے مسائل خواہ علامتی ہوں یا استعاراتی، تمثیلی ہوں یا تخلیقی، تجریدی ہوں یا ابہامی، معنویت کا نظام اور کہانی کا کہانی کے طور پر پڑھا جانا بنیادی وصف ہے۔ گویا کہانی سے کہانی پن کا اخراج ایک غیر افسانوی عمل ہے۔ ان جیسے کہانی کاروں کا تصوراتی ادبی رشتہ اجتماعی لاشعور کے ان صدیوں پرانے تقاضوں، روایتوں اور تہذیبی و حکایتی مزاج و افتادِ طبع سے ضرور رہا ہے جو صدیوں کے تجربوں سے حاصل ہونے والے فہم و دانش کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا :

> ''کردار کے نقوش کو اُجاگر کریں یا ٹائپ کو بروئے کار لائیں، بند ماحول کو پیش کریں یا کشادہ کینوس کو سامنے لائیں، قریب سے نظارہ کریں یا دور سے نظر ڈالیں، وہ ہر حال میں مجبور ہیں کہ کہانی کی سطح پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ بصورت دیگر افسانہ جواب مضمون بن جائے گا یا ایک شعری پیکر یا محض نثر کا ایک ٹکڑا۔''

(نئے مقالات، وزیر آغا، ۱۹۷۰ء)

اس ضمن میں مشہور افسانہ نگار رشید امجد کا خیال ملاحظہ کریں :

> ''افسانے میں چاہے وہ نیا ہو یا پرانا، کہانی پن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اختلاف دراصل کہانی پن کی تعریف کا ہے۔ ہمارے پرانے افسانہ نگار واقعات کے تسلسل یا اجتماع کو کہانی کہتے تھے، ہم خیال کی اکائی کو بھی اگر اس میں ترتیب قائم ہے، کہانی سمجھتے ہیں۔''

(رشید امجد سے ایک انٹرویو، اوراق، لاہور، ۱۹۹۰ء)

دوسری طرف فکشن اور شاعری کے معتبر تنقید نگار پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی کے خیالات بھی سنتے چلیں تا کہ مستور گوشے منور ہو سکیں :

> ''کہانی جس انداز کی بھی لکھی جائے، علامتی، تمثیلی اور مبنی بر حقیقت نگاری، کامیاب کہانی وہی ہوگی جو شعور کے مقابلے میں لاشعور اور کسی بیش قیمت تجربے پر مبنی ہونے کی صورت میں ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر بیدار

کر سکے۔ ہمارے لئے فراواں، حیرت، مسرت، آگہی اور بصیرت کے اسباب مہیا کر سکے۔''

(تنقید و تفہیم، قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، ۲۰۱۲ء، ہم عصر اردو افسانہ، ص:۲۰۲)

افسانے کے حوالے سے محولہ بالا گرانقدر آراء کی روشنی میں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ جس طرح غزل کے لئے تغزل کا ہونا بنیادی شرط ہے، اسی طرح افسانے کے لئے کہانی اور افسانویت کا ہونا لازمی ہے۔ افسانویت میں اسلوب، زبان، تکنیک، ہیئت سب کچھ آجاتے ہیں جو ہمیں ایک ایسے ذائقے کا احساس دلاتے ہیں جس میں یہ سارے اجزا تحلیل ہو جائیں۔ اسے آسانی کے لئے اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ موسیقی میں بہت سارے سُر ایک دوسرے میں مدغم ہو کر دلکش و دلربا نغمے کو جنم دیتے ہیں۔

اردو کے افسانوی ادب کو جن لوگوں نے اپنے افسانوں کے ذریعہ وسعت و استقامت بخشی، قارئین کو اپنا گرویدہ بنایا، ناقدین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور نئی فنی بلندیاں سر کیں، ان میں ایک قابل ذکر نام سیّد احمد قادری کا ہے۔ سیّد احمد قادری نے اپنی کہانیوں سے افسانوی ادب کو ایقان و اعتبار سے ہمکنار کیا ہے اور ان راہوں میں اپنے نقوش قدم بھی مرتسم کیے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مقلدین کی بھیڑ میں ان کی آواز گم نہیں ہوتی اور کہانی کے بنیادی تقاضوں کو انہوں نے فراموش بھی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نئے تجربے کی تازگی و تابانی کے ساتھ ساتھ مشاہدات و مظاہر کا تنوع موجود ہے جو ان کی قوت و عظمت کو ضو بار کرتے ہیں۔

سیّد احمد قادری ایک کثیر الجہات اور کثیر الصفات شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تحریرات کا کینوس بے حد وسیع رہا ہے اور ان کا ادبی تشخص مختلف خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ وہ بیک وقت ناقد، محقق، صحافی، ادیب، افسانہ نگار، مؤلف، مترجم اور مرتب ہیں۔ لہٰذا ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ان اصناف کے وسیلے سے اپنی طبیعت کی جولانی دکھائی ہے اور اپنا انفراد و امتیاز بھی قائم کیا ہے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ بنیادی طور پر سید احمد قادری نے ایک ممتاز، منفرد، مفتخر اور معتبر افسانہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی ہے۔ موصوف کی تحریروں میں نہ صرف ان کے نقوش قدم بہ آسانی تلاش کئے جا سکتے ہیں بلکہ ان کے امتیازی اوصاف کی زرخیزی و زرتابی بھی نمایاں ہوتی ہے۔

سیّد احمد قادری نے 'ریزہ ریزہ خواب' (۱۹۸۵ء)، 'دھوپ کی چادر' (۱۹۹۵ء) اور 'پانی پر نشان' (۲۰۰۶ء) جیسے افسانوی مجموعے کی معنی خیزی و معنی آفرینی کے ذریعہ افسانوی تاریخ میں اپنی مہر ثبت کر دی ہے۔ ان مجموعوں کی کہانیوں کا اختصاص یہ ہے کہ زندگی کی قدروں کی خواہ وہ معاشرتی ہوں یا تہذیبی، سیاسی ہوں یا مذہبی، تاریخی ہوں یا ثقافتی، عمرانی ہوں یا سماجی، ہر ایک کی بھرپور نمائندگی ان میں ملتی ہیں۔ اور یہ

ISSN : 2582 - 3612

نمائندگی داخلیت اور خارجیت کے شعوری عمل کے وسیلے سے تخلیقی اور بیانیہ اسلوب اظہار کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جو افسانہ اور قاری کے درمیان وقوع پذیر ہونے والے رشتے کے انہدام کو بچائے رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہاں زندگی کی تفہیم اور اس کی شناوری کے گہرے اور منفرد تجربے کی فراوانی رہی ہے جو ان کے افسانوں کو تہ داری وطرح داری عطا کرتی ہے۔ دراصل سید احمد قادری نے اپنے عہد کے واقعات وحادثات اور تضادات وتصادمات کا دوربین نگاہوں سے مطالعہ ومحاسبہ کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کیا ہے اور پھر اپنے تجربات میں قاری کو شامل کر کے اپنے افسانوں کو تخلیقی شعلگی سے ہم رشتہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

''ملبہ'' (۲۰۱۵ء) سید احمد قادری کا حالیہ اور تازہ افسانوی مجموعہ ہے جس میں ان کے گہرے مطالعے، مشاہدے، تجربے اور طویل ریاضت ومحبت کا خاصا دخل رہا ہے۔ اس مجموعے کے ذریعہ سید احمد قادری نے اردو افسانے کا ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے جو نہ صرف اپنی ہمہ رنگی اور ہمہ جہتی کے سبب اپنے پیش رووں کے تجربات کی تکرار سے انحراف ہے بلکہ نئے امکانات ومضمرات سے روشن بھی ہے۔ ''ملبہ'' میں سید احمد قادری نے حیات وکائنات کے مختلف رنگ وآہنگ کو بڑی ذمہ داری، چابک دستی اور ہنرمندی کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ''ملبہ'' کے محتویات اس بات کا انکشاف کرتے ہیں کہ زندگی کے حقائق کو سید احمد قادری نے زبان عطا کردی ہے اور زندگی کے کلیدی آفاق کو روشن کردیا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''ملبہ'' بیالیس (۴۲) افسانوں پر مشتمل ہے جس میں چند افسانے گذشتہ مجموعوں سے بھی شامل کئے گئے ہیں لیکن بیشتر افسانے نئے ہیں۔ ان افسانوں میں کچھ علامتی وتمثیلی ہیں تو کچھ استعاراتی وبیانیاتی لیکن ہر جگہ ماجرا سازی، کردار نگاری اور بیانیہ طرز اظہار نے ان افسانوں کو بالیدہ و بامعنی بنادیا ہے۔ یہ سارے افسانے نہ صرف زندگی کے مختلف ومتنوع گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں بلکہ کہانی کے اعلیٰ ترین تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ موضوعات کی سطح پر ان میں ہمہ گیری کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف محسوسات کی سطح پر بھی ان میں وہ واردات وکیفیات شامل نظر آتی ہیں جن کی بدولت دل اور ذہن مضطرب ومرتعش ہوجاتے ہیں۔

''ملبہ'' سید احمد قادری کے چالیس برسوں کی ریاضت کی زندہ اور تابندہ مثال ہے جس میں انہوں نے اپنی فنکارانہ صلابت، خداداد صلاحیت، گہری حساسیت، ذہنی بالیدگی، سنجیدہ گامی، قلم کی سبک ساری، ژرف نگاہی اور تخلیقی تب وتاب کے وہ جواہر دکھائے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر ایک نئی سرشاری اور تازگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی نادرہ کاری قابل دید ہوجاتی ہے۔ ہم سید احمد قادری کے ان افسانوں کو پڑھ کر سرسری طور پر نہیں گزر سکتے ہیں۔ یہ افسانے ہمیں کہیں چونکاتے ہیں تو کہیں غور وفکر کے لئے مجبور کرتے

R.N.I. No. : BIHURD/2019/78036

ہیں، کوئی واقعہ یا موضوع ہمیں استعجابی و تحیراتی کیفیتوں میں مبتلا کرتا ہے تو کوئی کردار اپنے عمل اور ردِ عمل کی وجہ سے ہمارے ذہن کے تاروں میں انتشار و ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ کبھی جذبات کی آندھیاں خس و خاشاک کی طرح سب کچھ اُڑا کر لے جاتی ہیں تو کبھی حالات کی سفاکی حسین خوابوں کے محل کو زمیں بوس کر دیتی ہیں، کبھی دل میں خواہشوں اور امنگوں کے دریا موجزن ہوتے ہیں تو کبھی زندگی درد کے صحرا میں بھٹکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں دل کے کنج میں پھول کھلنے کی سرخوشی محسوس ہوتی ہے تو کہیں ناتمام خواہشات کی محزونی کا احساس ہوتا ہے۔ کہیں محبوب کی یادوں کی دستک سنائی دیتی ہے تو کہیں بے لوث محبت کا فقدان دکھائی دیتا ہے۔ گویا زندگی کے تمام تر وسعت و آفاق اور عرفان و آگہی قدرے تازگی و شگفتگی اور حد وندرت کے ساتھ ان کے افسانوں میں نہ صرف جلوہ گر ہوتے ہیں بلکہ ایک بڑے کینوس پر بھی پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔

عصری زندگی اور اس کے مسائل و معاملات کی عکاسی کی زندہ تصویروں کے مناظر و مظاہر کا مطالعہ سید احمد قادری کے ''ملبہ'' میں کیا جا سکتا ہے۔ قادری نے مسلسل سلگتے ہوئے مسائل، وجودی تہذیبی، نفسیاتی اور گہرے سیاسی و سماجی سروکار کو اپنی مرتعش فکر کا محور بنایا ہے۔ بے مہری حیات کی ناقدری و ناسپاسی، تاجرانہ ذہنیت کی بالادستی' بازاری' تہذیب کے جس عہد سے ہم گزر رہے ہیں اور جس درد و کرب اور انحطاط و زوال کو انسانی زندگی جھیل رہی ہے، اس کے تناظر میں سیّد احمد قادری کے افسانوں کی افادیت و معنویت بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کے فکری رویے اس طرح سامنے آتے ہیں کہ کہیں بھی تصنع اور بناوٹ کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ مشینی زندگی کے تمام تر خد و خال ان کی نگاہوں میں رہے ہیں اور آج کی زندگی جو پیچیدگی اور ریاکاری کا مرقع بنی ہوئی ہے، وہ بھی ان کے حلقۂ فکر و خیال میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔

سیّد احمد قادری کے افسانوں کے انفراد و اختصاص کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں کسی فکر و فلسفہ، رجحان و میلان، عقیدہ و نظریہ اور آئیڈیولوجی یا منشور کا کوئی جبر نہیں ہے اور نہ ہی کسی بنی بنائی لکیر یا فارمولے کے مطابق لکھنے پر اصرار ہے۔ انہیں اس امر کا اندازہ ہے کہ کسی مخصوص آئیڈیولوجی یا کلیشے میں فنکار جب مقید و محصور ہو جاتا ہے تو فن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور فن پارہ کہیں دور پڑا ہانپتا رہتا ہے۔ انہوں نے پورے ایمان و ایقان کے ساتھ زندگی کو اپنے افسانوں میں تمام فنی لوازم کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ کہانی صنفی قدر و قیمت سے محروم ہوئے بغیر فضا میں خوشبو کی صورت پھیل جاتی ہے اور اپنے قاری کو ایک مسرت آمیز ذہنی اضطراب اور روحانی خلش میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہے۔ سیّد احمد قادری نے حالات و کوائف کو اس طرح سمیٹا ہے کہ زندگی کی بے کرانی و بے مائیگی کے ساتھ ساتھ

اس کی تلخیاں و ترشیاں نمایاں ہو کر دل و دماغ کو ایک خاص قسم کا تاثر دینے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ قادری نے مزاحم قوتوں کے خلاف اپنے احتجاج و اضطراب اور تنفر و تغفض کے حق کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ اپنی کہانیوں کی بنت کاری میں انہوں نے اس قدر چابک دستی، مہارتِ فن، شعور باطن اور بالغ نظری کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ پڑھ کر طبیعت شگفتہ و سرشار ہونے کے ساتھ ساتھ بے چین و بے کیف ہو جاتی ہے۔

عہد حاضر میں گلوبلائزیشن کے حوالے سے جس طرح آج دہشت و بربریت، تشدد و غارت گری اور نسل کشی کے واقعات سے پیدا شدہ مناظر نظر آتے ہیں اور روح کو پارہ پارہ کر دینے والے سفاکانہ مظالم اور سیاسی و سماجی جبر کی دلدوز کہانیوں سے ہمارے ذرائع ابلاغ بھرے دکھائی دیتے ہیں، اس حقیقت سے کسی کو انکار و انحراف نہیں۔ سید احمد قادری ایک اولوالعزم فنکار ہیں اور حرمت منصب سے آشنا بھی، اس لئے وہ ان سفاک حقائق سے چشم پوشی کرنے کے بجائے اس عہد کی زخم خوردہ روح سے ہم کلام ہونے کی جسارت کرتے ہیں اور تہذیب جدید کے چہرے پر پڑی ہوئی دبیز نقاب کو الٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قادری کے افسانے معاشرتی زبوں حالی، سیاسی سماجی ظلم و استبداد، استحصال و فریب کاری اور آمریت کے خلاف اضطراب و احتجاج اور غم و غصّے کی افزائش کا سبب بھی بنتے ہیں اور ہمارے ذہن و ضمیر پر بہت دیر تک نشتر زنی کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

''ملبہ'' کے محتویات میں موضوعات کی فراوانی ہے۔ چونکہ سید احمد قادری کا وژن آفاقی ہے، اس لئے کسی مخصوص موضوع پر اکتفا کرنا ان کا شیوہ نہیں۔ وہ بغیر کسی ترغیب، خوف یا ذہنی دباؤ کے اپنی صوابدید کے مطابق موضوعات منتخب کرتے ہیں اور اپنی صلابت فکر اور فطانت ذہن کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ زندگی کی ناہمواریاں، قدروں کی شکست و ریخت، تہذیبی انہدام، ثقافتی زوال، جنگ و جدال کے مناظر، زرو جواہر کی لعنت، نیوکلیائی اسلحوں کے سر ابھارتے خدشات، گلوبل کلچر، فرد اور سماج کے مابین تزاحم و تصادم، سرمائے کے تسلط کے نئے پیرائے، سائبر اور انٹرنیٹ سماج، صارفیت کا پھیلاؤ، سسکتے ہوئے معصوم چہرے، فاقہ کش لوگ، رشتوں کی مٹی کی تمنا کی وغیرہ سارے موضوعات ان کے محتویات میں شامل رہے ہیں۔ ان کا ہر افسانہ زندگی کے کسی نہ کسی شفق پر محیط ہوتا ہے جس کے مناظر دیکھ کر دیدۂ حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے اور رگوں میں خون منجمد ہو جاتا ہے۔ چونکہ قادری نہ تو قنوطی ہیں اور نہ رجائی بلکہ قنوطیت اور رجائیت ان کے افسانوں میں کچھ اس طرح ہم آمیز ہو گئے ہیں کہ ایک نئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور جس جس جگہ جس شق کا تقاضہ ہوتا ہے، وہ ابھرتی ہے۔

''ملبہ'' کے افسانے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں کہ ان کی نیرنگی و بوقلمونی نے ایک پورا جہان آباد کر رکھا ہے لیکن سارے افسانوں پر الگ الگ بحث کرنا مقصود نہیں۔ پھر بھی کچھ افسانوں کا ذکر ناگزیر ہے

کہ یہ افسانے نہ صرف 'افسانوی انتخاب' میں شامل ہونے کے لائق ہیں بلکہ سید احمد قادری کی ذہنی بالیدگی کا ہمیں بھرپور احساس دلاتے ہیں۔

افسانہ ''ملبہ'' سیّد احمد قادری کا شاہکار افسانہ ہے۔ اس افسانے میں روح عصر کچھ اس قدر پیوست ہے کہ مادّی حقائق کے تمام نقوش ونفوس جلوہ ساماں نظر آتے ہیں۔ اس افسانے میں انہوں نے وقت کی آندھی اور ملک کی تباہ کاریوں کا نوحہ پیش کیا ہے۔ وقت کی آندھی میں سب کچھ تباہ ہو جاتا ہے، کچھ بھی سالم نہیں رہتا ہے۔ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو صرف ملبہ اور یہ 'ملبہ' رہ رہ کر تڑپاتا ہے اور کرب میں اضافہ کرتا ہے۔ ہم خاموش تماشائی کی طرح صرف تباہی و بربادی کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ سید احمد قادری نے یہاں تباہ ہوتی ہوئی زندگی اور ملبہ کی صورت میں بکھرے ہوئے وجود کی بُت کاری ہنرمندانہ طریقے سے کی ہے۔ ایک ایسی زندگی اور ایک ایسا وجود جو کبھی اپنی پہچان رکھتا تھا لیکن وقت کے ملبے میں وہ شناخت اور پہچان معدوم ہوگئی۔ اس کی منظرکشی میں صرف خارجیت ہی نہیں، داخلیت بھی نظر آتی ہے جو قاری کے قوت مشاہدہ اور جمالیاتی حس کی وساطت سے ایک محاکاتی فضا قائم کر دیتی ہے۔ آج کے تناظر میں اس افسانے کا موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ آج پوری دنیا میں سیاسی ریشہ دوانیوں کے سبب جس طرح انسانیت خاک بسر اور انسانی وجود روحانی تشنج اور خلفشار سے دوچار ہے، یہ وہ مناظر اور مقامات ہیں، جن کی نظیر انسانی آنکھوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وجودی دہشت، اذیت اور اصطباغ ذہنی اس مقام تک آپہنچی ہیں کہ ہماری روح پر تازیانے لگاتے رہتے ہیں۔ قادری نے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی خیر اور صداقت کی جستجو میں رخت سفر باندھ رکھا ہے۔ یہ افسانہ دیر تک ہمارا تعاقب کرتا ہے اور ہمارے وجود کے نہاں خانوں میں بازگشت کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ ہماری حسیت کا مقدس حصہ بن جاتا ہے۔

افسانہ ''اولڈ ایج ہوم'' انسان کے بدلتے مزاج کو ظاہر کرتا ہے اور موجودہ عہد کے سنگین مسئلوں پر گفتگو کی فضا ہموار کرتا ہے۔ یہ اپنے اندر کئی ابعاد و جہات رکھتا ہے۔ اس افسانے میں موجودہ عہد اور زندگی کی تمام تر تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ تنہائی اور تاریکی کے جبر نے شدت کے ساتھ دلوں پر ڈیرہ جما رکھا ہے لیکن ہماری بے حسی اور مفاد پرستی ہمیں اس گھٹن کا اندازہ لگانے میں مانع رکھتی ہے۔ انسانوں کے بیچ محبت، خلوص اور تقدس کی جو فضا قائم ہوئی تھی، اب وہ بہت حد تک مکدر ہوگئی ہے۔ زندگی کی اس تلخ حقیقت کی تصویرکشی مہارت سے کی گئی ہے۔ معاشرے کی مایوس کن صورت حال، اخلاقی و تہذیبی زوال اور اقدار کی پامالی کے باوجود قادری مایوسی، غصہ اور احتجاج کے شکار نہیں ہوتے ہیں بلکہ ایک مثبت فکر کے ساتھ جیتے ہیں جو ان کے افسانوں کے کلیدی آفاق بن جاتے ہیں۔

''دوراہے پر کھڑی زندگی''، ''دنیا ننگی ہے''، ''مانگے کا اُجالا''، ''آنگن کی بات''، ''دستک رشتوں

کی''وغیرہ جیسے افسانے آج کے مسائل سے آنکھیں چار کرتے ہیں۔آج انسان نت نئے مسائل میں الجھا ہوا ہے اوران سے نجات بھی حاصل کرنا چاہتا ہے جس کے لئے وہ طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرتا ہے اور سکون قلب کے لئے سو سو طرح کے جتن بھی کرتا ہے لیکن سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔افسانہ نگار کی ذہنی کشمکش اوراس کے درد کی زیریں لہریں ان افسانوں میں اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں اور زندگی کے تمام مظاہر وامکانات کواجزا میں تقسیم کر کے دیکھنے کے بجائے فرد اور سماج، زمین اور زماں، جسم اور جاں کو ایک غیر منقسم اکائی کے طور پر تسلیم کراتی ہیں۔

یہ اوراس طرح کے کئی افسانے آپ کو''ملبہ''میں بکھرے دکھائی دیں گے،جن میں نادرہ کاری کے ساتھ ساتھ فنکاری بھی نظر آئے گی۔ ان کے افسانے طویل ہوں یا مختصر،اپنے بیانیہ کی داخلی قوت اور ہنرمندی کے سبب اپنے اندر بے پناہ اثر پذیری اور جاذبیت کے امکانات رکھتے ہیں۔سید احمد قادری کے حدیث دل اور حکایت آرزو سماجی نظام کے تمام تر صفات سے اس قدر مزین ہیں کہ ان میں ایک ایسے دھڑکتے دل کی آواز سنائی دیتی ہے جو درد جہاں کا پیام دیتی ہے۔سید احمد قادری نے جہاں زبان وبیان کی سطح پر افسانے کو نیا پن اور ندرت بخشا ہے، وہیں افسانوں کے فکری اور معنوی پس منظر کو بھی وسعت وگہرائی عطا کی ہے۔

سیّد احمد قادری کے افسانوں کا اختصاص پڑھنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔''ملبہ''موصوف کے فکروفن کی ارتقائی صورت ہے جس پر پڑھنے والوں کی نظر ہونی چاہئے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی انفرادیت واہمیت کو تسلیم کرنا انصاف کے عین متقاضی ہے۔

Dr. Asim Shahnawaz Shibli
P. G. Deptt. of Urdu
Moulana Azad College
Kolkata
Mob.- 98311 56932

مغربی بنگال اردو اکاڈمی کا سہ ماہی رسالہ

یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل

روحِ ادب

اپریل تا جون ۲۰۲۲ء

مغربی بنگال اردو اکاڈمی

محکمہ اقلیتی امور و مدرسہ تعلیم، حکومت مغربی بنگال

صحافت نمبر

R.N. At 12071/66

Price :₹ 15/-

ROOH-E-ADAB

A UGC-CARE LISTED JOURNAL

A Quarterly Literary Magazine of West Bengal Urdu Academy
Under Minority Affairs & Madrasah Education Department, Government of West Bengal
75/2A, Rafi Ahmed Kidwai Road, Kolkata - 700016

Volume : 38 APRIL- JUNE 2022 Issue No. : 145

اکاڈمی کی نئی مطبوعات

Printer & Publisher : Nuzhat Zainab (WBCS-Exe) Secretary, West Bengal Urdu Academy
Printed at Digital Graphic- 6, Taltala Lane, Kolkata-700 016, Cover Design by Razi Ahmed
Published from West Bengal Urdu Academy, 75/2A, Rafi Ahmed Kidwai Road, Kolkata - 700016
E-mail : sahmahirooheadab@gmail.com Web : www.wbua.org

مشمولات

اداریہ :		04
خصوصی پیش کش :		
☆ اردو صحافت کی دوصدیاں: تعیین قدر کے بنیادی سوالات	شافع قدوائی	07
اردو صحافت ساخت، پرداخت اور تکنیک		
☆ فن اخبار نویسی	مولانا ابوالکلام آزاد	14
☆ اخبارات ورسائل کی ترتیب وتدوین	ظ- انصاری	18
☆ اردو صحافت کا کردار	غضنفر علی	23
☆ ہندوستانی زبانوں میں اخبار نویسی اور اس سے متعلق قوانین	شوکت علی	27
☆ ہندوستان میں عربی صحافت کا ارتقا اور اس پر اردو صحافت کے اثرات	ڈاکٹر محمد شہاب الدین	38
☆ ریڈیو کی اردو خبریں: ایک تجزیاتی ولسانی ڈسکورس	ڈاکٹر محمد شکیل اختر	43
☆ صارفیت اور اردو صحافت	ڈاکٹر امتیاز وحید	50
☆ اردو صحافت کا لسانی مطالعہ	ڈاکٹر درخشاں زریں	54
☆ اردو صحافت کا عوامی مزاج	حلیم صابر	64
☆ اردو صحافت اور حکمت وطبابت	ڈاکٹر افتخار احمد	67
☆ اردو زبان وادب پر سوشل میڈیا کے اثرات	ڈاکٹر محمد کاظم	73
☆ زبان وادب اور ثقافت کے فروغ میں اردو صحافت کے کردار	شیخ ظہور عالم	75
اردو صحافت آئینہ ایام میں		
☆ اردو صحافت کے دوسو سالہ تاریخ کا مختصر جائزہ	سہیل انجم	77
☆ اردو صحافت: کل اور آج	مقصود دانش	84
☆ اردو صحافت: تابناک ماضی اور تشویش ناک حال	ڈاکٹر نوشاد مومن	87
☆ اردو جرنلزم کی دوصدی: ایک مختصر جائزہ	ڈاکٹر آسیہ پروین	91
☆ اردو زبان میں "پنچ" اخبارات	ڈاکٹر نصرت جہاں	95
☆ اردو صحافت پر ایک نظر	ڈاکٹر امتیاز احمد الائی	99
☆ اردو صحافت کے ماضی اور حال کا اجمالی جائزہ	ڈاکٹر ریاض احمد	103
☆ اردو فن صحافت: مسائل وامکانات	شعیب احمد وانی	107
اردو صحافت کے معمار		
☆ اردو صحافت کے چند نامور غیر مسلم صحافی	ڈاکٹر منصور عالم	112
☆ اردو کا پہلا اخبار: جام جہاں نما	ڈاکٹر وسیم احمد	124
☆ سرسید احمد خان کا صحافتی کردار	محمد ارشاد	128

☆ مولوی محمد باقر: قومی صحافت کا نقاش اول	ڈاکٹر صفدر امام قادری	133
☆ الہلال اور مولانا غیر رسالی	ڈاکٹر حسین	143
☆ اردو صحافت کا گوہر آب دار: عبدالحلیم شرر	شاہد اقبال	154
☆ تحریک آزادی میں 'زمیندار' کا کردار	ڈاکٹر سعید احمد	159
☆ مولانا محمد علی جوہر اور ہمدرد	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی	165
☆ مولانا محمد علی جوہر کی صحافت	ڈاکٹر مظہر حسین	170
☆ اردو صحافت کا ایک فراموش باب: مولانا شوکت علی	ڈاکٹر سیما صغیر	178
☆ اردو صحافت اور حسرتؔ موہانی	ڈاکٹر محمد امین عامر	183
☆ اردو صحافت اور ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینے میں	ڈاکٹر شبانہ آفرین جاوید	188
☆ قلم بدست محبت وطن صحافی: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	ڈاکٹر مجیر بلال بھارتی	192
☆ اردو صحافت کا ایک سنگ میل: اشتیاق سعید	پروفیسر صغیر افراہیم	198
☆ قاضی عبدالغفار کی صحافتی خدمات	محمد جہانگیر خان	202

بنگال میں صحافت

☆ بنگال میں فارسی صحافت	ڈاکٹر غلام سرور	208
☆ بنگال میں فارسی صحافت پر ایک نظر	ڈاکٹر عبدالواسع	214
☆ صحافت کی جنم بھومی کلکتہ اور اردو صحافت	ڈاکٹر سید احمد قادری	218
☆ بنگال میں اردو صحافت کے دو سو برس اور نئے امکانات	افضال احمد	223
☆ مغربی بنگال میں اردو کے اہم اخبار نویس	انجم عظیم آبادی	228
☆ مغربی بنگال میں بچوں کے اردو رسائل	شگفتہ جہاں	233
☆ پرویز شاہدی کی صحافتی خوبیاں	آصف پرویز	239
☆ احمد سعید ملیح آبادی: ممتاز صحافی و قائد قوم و ملت	نسیم عزیزی	244
☆ آبروئے صحافت: ڈاکٹر جاوید نہال	محمد اتمش خالد	247
☆ وادیِ صحافت کا ایک گم نام مسافر: محمد حنیف	ڈاکٹر تسلیم عارف	251

☆☆☆

کمپوزنگ : **شیخ پرویز** ☆ مطبع : ڈیجیٹل گرافکس، تانتا لین، کولکاتا-700014

◆ محمد منظر حسین

مولانا محمد علی جوہر کی صحافت

ہندوستان کی تاریخ میں علی برادران کی شناخت کئی حیثیتوں سے مستحکم ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا محمد علی شوکت مجاہدین آزادی کے علاوہ بھی دونوں اپنی اپنی خدمات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ دونوں برادران کی ادبی اور سماجی حیثیت نہایت مستحکم ہے۔ میرا مقصد دونوں برادران کا تقابلی جائزہ لینا نہیں۔ لہٰذا میں نے اپنے اس مضمون میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے مشہور زمانہ اخبار ''ہمدرد'' کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

۳۵۱
MOHUMMAD ALI URDU DAILY "HAMDARD"
ہمدرد
برقیات

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کثیرالجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک عظیم سیاسی رہنما کے ساتھ ساتھ ملت اسلامیہ کے اہم قائدین میں سے ایک تھے۔ وہ بیک وقت ایک اچھے خطیب نیز ادیب وشاعر بھی تھے۔ انہوں نے شاعری کے ساتھ اردو نثر میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ صحافت ان کا خاص میدان رہا ہے۔ انگریزی زبان میں انہوں نے صحافتی شہر کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار ''کامریڈ'' جاری کیا جب کہ اردو صحافت کو انہوں نے روزنامہ ''ہمدرد'' کے ذریعہ جلا بخشا۔

مولانا محمد علی کی پیدائش ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ کو رام پور میں ہوئی۔ دو برس کی عمر میں ہی والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم وتربیت گھر پر ہی ہوئی۔ اس کے بعد انہیں مدرسہ میں داخل کرایا گیا۔ لیکن اسی سال انہیں تعلیم کی غرض سے بریلی بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا سفر کیا اور ساتویں جماعت میں داخلہ لیا۔ محمد علی کے بڑے بھائی مولانا محمد شوکت علی نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں تو وہ انہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیج دیں گے۔ اس وعدہ کا یہ اثر ہوا کہ محمد علی نے ۱۸۹۸ء میں بی۔اے کے امتحان میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی۔ مولانا محمد شوکت علی نے اپنے بھائی کی محنت ولگن کو دیکھ کر نہ صرف خوش ہوئے بلکہ اپنا وعدہ بھی پورا کیا۔ انہوں نے محمد علی کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلینڈ بھیج دیا۔ محمد علی سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے آکسفورڈ پہنچے لیکن حالات اور قسمت نے انہیں امتحان میں کامیاب ہونے نہیں دیا۔ اس ناکامی سے ان کے بھائی دل برداشتہ ہو گئے۔ والدہ کی خواہش پر محمد علی واپس ہندوستان آ گئے۔ وہ ہندوستان تو واپس آ گئے لیکن ان کا دل آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہی اٹکا رہا۔ انہوں نے خود سے تیاری کی اور آکسفورڈ کے لنکن کالج سے موڈرن ہسٹری میں بی۔اے (آنرس) میں سکنڈ ڈویژن سے کامیابی حاصل کی۔ اس طرح وہ نہ صرف ہندوستان کی کسی یونیورسٹی بلکہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے والے رام پور کے پہلے شخص بن گئے۔

مولانا محمد علی کی شخصیت بہت ہی بارعب تھی۔ وہ جس چیز کا ایک بار ارادہ کر لیتے تھے اسے مکمل کر کے ہی دم لیتے تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کے پہلے اور آخری رہنما تھے جنہوں نے رسوم ورواج، رہن سہن، عقائد وافکار، شوق میلان، تعلیم وتربیت، سیاسی وسماجی بصیرت غرض کہ زندگی کے ہر پہلو میں راہ نمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو انگریزوں سے دوستی اور غلامی کے فرق کو بتایا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلافات تھے اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ جنگ آزادی میں ایک دوسرے کو شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا درس دیا۔ یہ ان ہی کا کارنامہ تھا کہ جنگ آزادی کی تحریکوں اور خلافت تحریک کے درمیان ایک طرح کا ربط قائم ہو

اس تعلق سے مولانا محمد علی لکھتے ہیں۔

''ہمدرد جاری کرنے کا کوئی فی البدیہہ نتیجۂ فکر نہیں کے وزن اور چاپ کے تاب میں ڈھل کر زرادیر میں احباب کی مجلس میں اچھل ڈال دے، کسی گھبرائے ہوئے دل کا عارضی جذبہ نہیں جسے قوت واہمہ پلک مارتے صورت کا لباس پہنا کر موجود کر دے، بلکہ یہ نتیجہ ہے اخباری دنیا میں عرصے تک رہنوردی کرنے، سیکڑوں ٹھوکریں کھانے اور بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کا، قوم کی زندگی کا خلوت کدوں سے لے کر بازاروں تک مطالعہ کرنے کا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ قوم کے لیے ایک ایسا رفیق سفر تیار کر دیں جو منزل مقصود کو دور سے نہ دکھائے بلکہ گم گشتگان راہ کے ساتھ برہنہ پا ہو کر ایسے قصے کو پیدا کریں جو اصل داستان کو الف لیلیٰ کی طرح روز سنایا کرے اور جب تک قوم کی فلاکت اور نکبت ختم نہ ہو، یہ داستان بھی ختم نہ ہو۔''

(مولانا محمد علی جوہر: سیاست، صحافت، شاعری۔ ڈاکٹر منور حسن کمال، صفحہ۔۱۲۲)

مولانا محمد علی جوہر نے اپنے اخبار ''ہمدرد'' کے ذریعہ نہ صرف لوگوں کے سیاسی شعور کو بیدار کیا بلکہ ملک کی جنگ آزادی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے اپنی صحافت کے ذریعہ اردو نثر کو فکر انگیز تحریروں سے مالا مال کیا۔ ان کی تحریروں میں کہیں بھی خوف کا شائبہ نظر نہیں آتا ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان کے قلم سے ہمیشہ سچی اور بے خوف تحریریں نکلتی تھیں۔ انہیں الفاظ کے استعمال پر عبور حاصل تھا اور اس لیے روانی آپ کی تحریروں کی خاص صفت ہے۔ آپ ہمیشہ عام فہم نثر لکھتے اور مشکل پسندی سے اپنے آپ کو ہمیشہ دور رکھا۔ ایک صحافی کئی علوم پر عبور رکھتا ہے اور یہ خاصیت مولانا میں موجود تھی۔ موجودہ حالات پر تبصرہ ہو، گرد و پیش کے مسائل ہوں یا کوئی اور موضوع آپ کا قلم ہر جگہ سرپٹ دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر ان کی شاعری کی بات کی جائے تو یہاں بھی ان کی اپنی الگ انفرادیت ہے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے۔ خوف خدا، عشق رسول، قومی ہمدردی، حب الوطنی اور دنیا و مافیہا سے بے نیازی ان کی شاعری کے بنیادی اوصاف ہیں۔ یہ تھے مولانا محمد علی جوہر جنہوں نے اپنی پوری زندگی اور مال و دولت ملک اور قوم و ملت کے نام کر دیا۔ اس لیے ان کی خدمات کو کسی طور پر بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے بے لوث خدمت کی۔ کبھی بھی صلہ اور تمنا کی پرواہ نہ کی۔ مولانا کی خدمات کے تعلق سے ہندوستان کے صدر ذاکر حسین کی باتوں سے اتفاق کیا جانا چاہیے۔

''محمد علی کی زندگی کا بیان دراصل ایک قوم اور ایک ملت کے حال اور مستقبل کی تفسیر کرنا ہے کہ محمد علی اسلامی ملت اور ہندی قوم کا قائد تھا اور نا تمام بھی۔ ایک بیدار ہونے والے ملک ایک خواب گراں سے جاگنے والی ملت کی ساری بے چینی، سارا ولولہ شوق، ساری گرمی، ساری سرفراموشی، ایک پیکر خاکی میں جلوہ گر تھی۔ یہی نہیں اس کی ذات کا آغاز کار کی تمام تکلیفوں اور پریشانیوں، بے ترتیبوں اور ہنگاموں کا مظہر بھی نامساعد حالات سے جنگ پیہم، بے سروسامانی، بے یاری و مددگاری، ہمرہوں کی خفتہ پائی، ہم نواؤں کی کج فہمی، غرض کون سی چوٹ تھی جس نے اس کی روح کے گوشہ گوشہ کو گھائل نہ کر دیا ہو، ہماری قومی اور ملی زندگی کی اجمالی تصویر تھا، مگر بس ایک خاکہ دھندلا سا اور نامکمل۔ اس کی تکمیل کا پورا حق بیسویں صدی میں اسلام اور ہندوستان کی سرگزشت لکھنے والا مورخ ادا کر سکے تو کر سکے مگر اس نا تمام قائد کے سینے میں ایک آگ تھی جس کو چنگاری سے خفتہ ہستیں بے دار اور مردہ قومیں زندہ ہو جاتی ہیں۔ وہ آگ جو کبھی باطل دوستوں کے لیے بت نا گوار شعلہ نوائی کی شکل میں میں ظاہر ہوتی ہے، کبھی آنسو بن کر اس کی سرشار محبت آنکھوں سے ڈھلتی تھی، اپنے سوز کے اس دفینۂ آتشی سے وہ اپنی قوم کے نوجوانوں کے سینہ میں کچھ چنگاریاں منتقل کر گیا ہے، جو اس کے ان خوابوں کی تعبیر کی ضمانت ہیں۔ جنہیں نادان سمجھتے ہیں اس کے ساتھ ختم ہو گئے۔'' (ذاکر حسین)

میں اپنا مقالہ مولانا محمد علی جوہر کے شعر پر مکمل کرتا ہوں۔

عقل کو ہم نے کیا نذر جنوں
عمر بھر میں یہی دانائی کی

(مولانا محمد علی جوہر)

☆☆

Md. Manzar Hussain
Assistant Profess or, Deptt. of Urdu,
Maulana Azad College
E-mail : mdmanzarhussain@gmail.com

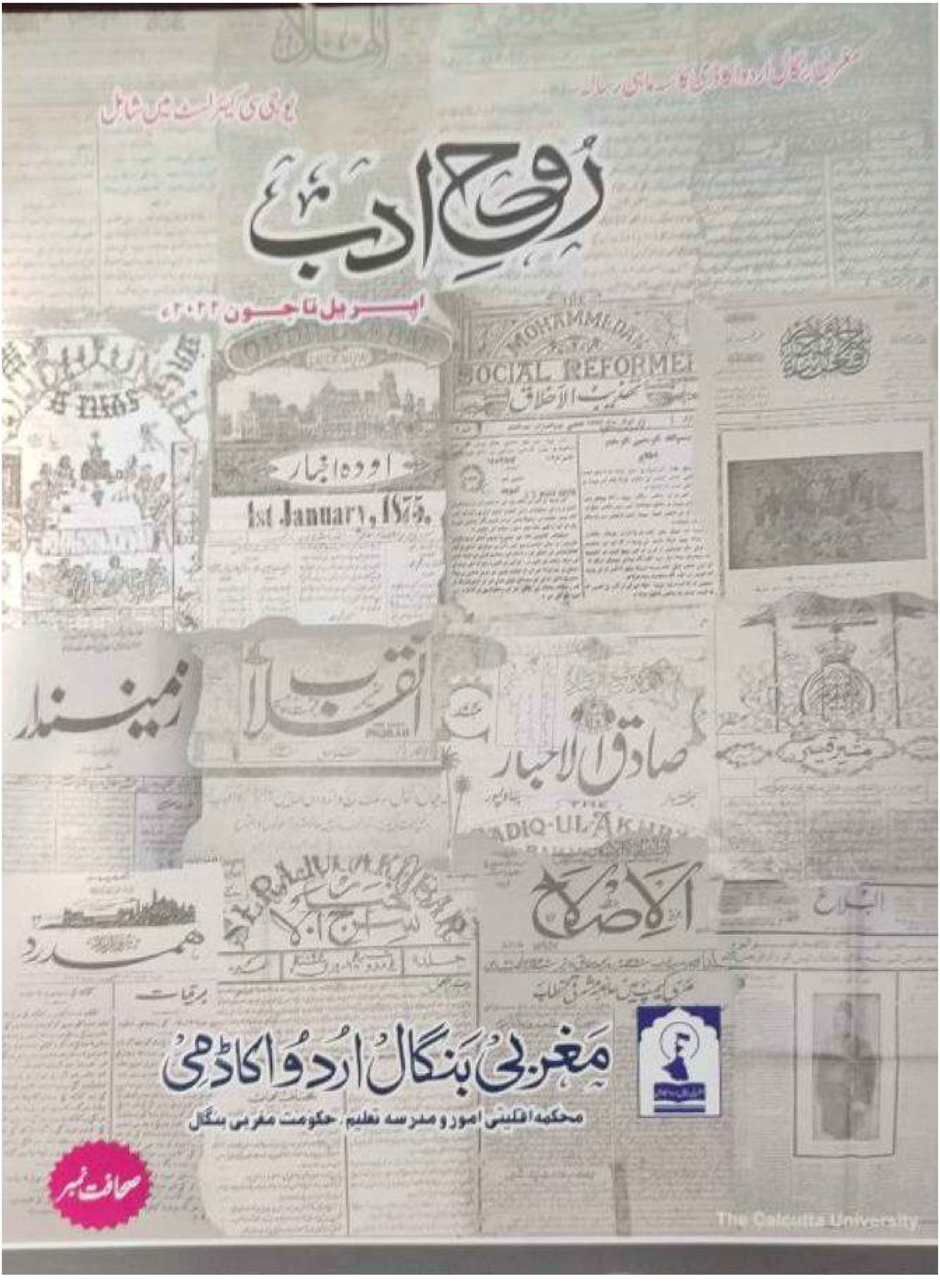
مغربی بنگال اردو اکادمی کا سہ ماہی رسالہ
یو جی سی کیئر لسٹ میں شامل
روحِ ادب
اپریل تا جون ۲۰۲۲ء
MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق
اودھ اخبار
1st January, 1875.
زمیندار
انقلاب
صادق الاخبار
الاصلاح
ہمدرد
مغربی بنگال اردو اکاڈمی
محکمہ اقلیتی امور و مدرسہ تعلیم، حکومت مغربی بنگال
صحافت نمبر
The Calcutta University

R.N. At 12071/66

Price :₹ 15/-

ROOH-E-ADAB

A UGC-CARE LISTED JOURNAL

A Quarterly Literary Magazine of West Bengal Urdu Academy
Under Minority Affairs & Madrasah Education Department, Government of West Bengal
75/2A, Rafi Ahmed Kidwai Road, Kolkata - 700016

Volume : 38 APRIL- JUNE 2022 Issue No. : 145

اکاڈمی کی نئی مطبوعات

Printer & Publisher : Nuzhat Zainab (WBCS-Exe) Secretary, West Bengal Urdu Academy
Printed at Digital Graphic- 6, Taltala Lane, Kolkata-700 016, Cover Design by Razi Ahmed
Published from West Bengal Urdu Academy, 75/2A, Rafi Ahmed Kidwai Road, Kolkata - 700016
E-mail : sahmahirooheadab@gmail.com Web : www.wbua.org

مشمولات

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ :		04
خصوصی پیش کش :		
☆ اردو صحافت کی دو صدیاں: تعین قدر کے بنیادی سوالات	شافع قدوائی	07
اردو صحافت ساخت، پرداخت اور تکنیک		
☆ فن اخبار نویسی	مولانا ابوالکلام آزاد	14
☆ اخبارات ورسائل کی ترتیب وتدوین	ظ-انصاری	18
☆ اردو صحافت کا کردار	ظفر علی	23
☆ ہندوستانی زبانوں میں اخبار نویسی اور اس سے متعلق قوانین	شوکت علی	27
☆ ہندوستان میں عربی صحافت کا ارتقا اور اس پر اردو صحافت کے اثرات	ڈاکٹر محمد شہاب الدین	38
☆ ریڈیو کی اردو خبریں: ایک تجزیاتی ولسانی ڈسکورس	ڈاکٹر محمد شکیل اختر	43
☆ صارفیت اور اردو صحافت	ڈاکٹر امتیاز وحید	50
☆ اردو صحافت کا لسانی مطالعہ	ڈاکٹر درخشاں زریں	54
☆ اردو صحافت کا عوامی مزاج	حلیم صابر	64
☆ اردو صحافت اور حکمت وطبابت	ڈاکٹر افتخار احمد	67
☆ اردو زبان وادب پر سوشل میڈیا کے اثرات	ڈاکٹر محمد کاظم	73
☆ زبان وادب اور ثقافت کے فروغ میں اردو صحافت کے کردار	شیخ ظہور عالم	75
اردو صحافت آئینہ ایام میں		
☆ اردو صحافت کے دو سو سالہ تاریخ کا مختصر جائزہ	سہیل انجم	77
☆ اردو صحافت: کل اور آج	مقصود دانش	84
☆ اردو صحافت: تاب ناک ماضی اور تشویش ناک حال	ڈاکٹر نوشاد مومن	87
☆ اردو جرنلزم کی دو صدی: ایک مختصر جائزہ	ڈاکٹر آسیہ پروین	91
☆ اردو زبان میں "پنچ" اخبارات	ڈاکٹر نصرت جہاں	95
☆ اردو صحافت پر ایک نظر	ڈاکٹر امتیاز احمد الائی	99
☆ اردو صحافت کے ماضی اور حال کا اجمالی جائزہ	ڈاکٹر ریاض احمد	103
☆ اردو فن صحافت: مسائل وامکانات	شعیب احمد وانی	107
اردو صحافت کے معمار		
☆ اردو صحافت کے چند نامور غیر مسلم صحافی	ڈاکٹر منصور عالم	112
☆ اردو کا پہلا اخبار: جام جہاں نما	ڈاکٹر دبیر احمد	124
☆ سرسید احمد خان کا صحافتی کردار	محمد ارشاد	128

☆ مولوی محمد باقر: قومی صحافت کا نقاش اول	ڈاکٹر صفدر امام قادری	133
☆ الجمعیۃ اور مولانا خیر رحمانی	ڈاکٹر حسین	143
☆ اردو صحافت کا گوہر آب دار: عبدالحلیم شرر	شاہد اقبال	154
☆ تحریک آزادی میں 'زمیندار' کا کردار	ڈاکٹر سعید احمد	159
☆ مولانا محمد علی جوہر اور ہمدرد	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی	165
☆ مولانا محمد علی جوہر کی صحافت	ڈاکٹر مظہر حسین	170
☆ اردو صحافت کا ایک فراموش باب: مولانا شوکت علی	ڈاکٹر سیما صغیر	178
☆ اردو صحافت اور حسرت موہانی	ڈاکٹر محمد امین عامر	183
☆ اردو صحافت اور ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینے میں	ڈاکٹر شاہانہ آفرین جاوید	188
☆ قلم بدست محبت وطن صحافی: مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	ڈاکٹر شجر جلال بھارتی	192
☆ اردو صحافت کا ایک سنگ میل: اشتیاق سعید	پروفیسر صغیر افراہیم	198
☆ قاضی عبدالغفار کی صحافتی خدمات	محمد جہانگیر خان	202

بنگال میں صحافت

☆ بنگال میں فارسی صحافت	ڈاکٹر غلام سرور	208
☆ بنگال میں فارسی صحافت پر ایک نظر	ڈاکٹر عبدالواسع	214
☆ صحافت کی جنم بھومی کلکتہ اور اردو صحافت	ڈاکٹر سید احمد قادری	218
☆ بنگال میں اردو صحافت کے دو سو برس اور نئے امکانات	افضال احمد	223
☆ مغربی بنگال میں اردو کے اہم اخبار نویس	انجم عظیم آبادی	228
☆ مغربی بنگال میں بچوں کے اردو رسائل	شگفتہ جہاں	233
☆ پرویز شاہدی کی صحافتی خوبیاں	آصف پرویز	239
☆ احمد سعید ملیح آبادی: ممتاز صحافی وقائد قوم وملت	نسیم عزیزی	244
☆ آبروئے صحافت: ڈاکٹر جاوید نہال	محمد التمش خالد	247
☆ وادیٔ صحافت کا ایک گم نام مسافر: محمد حنیف	ڈاکٹر تسلیم عارف	251

☆☆☆

کمپوزنگ : **شیخ پرویز** ☆ مطبع : ڈیجیٹل گرافکس، تالتلہ لین، کولکاتا 700014

✧ ڈاکٹر دبیر احمد

اُردو کا پہلا اخبار: جامِ جہاں نما

اردو کا پہلا اخبار کون سا ہے اس سلسلے میں ایک عرصے تک اہلِ قلم شکوک و شبہات کا شکار رہے۔ اب تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو کا پہلا اخبار 'جام جہاں نما' ہے جو کلکتے سے ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو نکلا۔ اس کی کچھ فائلیں نیشنل آرکائیو، دہلی میں موجود ہیں۔ اردو کے پہلے اخبار کے سلسلے میں بعض محققین ٹیپو سلطان کے فوجی اخبار کا نام بھی لیتے ہیں اور کچھ لوگ مولوی محمد باقر کے 'دہلی اخبار' کو اولیت کا سہرا پہناتے ہیں۔ اگر ٹیپو سلطان کا فوجی اخبار نکلا بھی تو وہ عوام تک خبر پہنچانے کے لیے نہ تھا، فوجیوں تک احکامات یا خبریں پہنچانے کے لیے رہا ہوگا۔ اس اخبار کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے، اور دہلی اخبار تو بعد کی اشاعت ہے اس پر سب متفق ہیں۔ 'جام جہاں نما' کے نسخوں کی متعدد فائلوں کی موجودگی دلیل ہے کہ یہی اردو کا پہلا اخبار ہے۔

حالات اور فطرت کے تقاضے کے تحت بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ اردو کا پہلا اخبار کلکتے سے نکلے۔ ہندوستان میں صحافت کی جنم بھومی کلکتہ ہے۔ پہلا انگریزی اخبار 'ہکیز بنگال گزٹ' یہیں سے ۱۷۸۰ء میں نکلا۔ ہکی ایسٹ انڈیا کا ملازم تھا۔ بعد میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بعض وجوہات کی بنا پر اس پر پابندیاں لگائیں اور اسے سزا بھی جھیلنی پڑی۔ کسی بھی ہندوستانی زبان میں پہلا اخبار بھی کلکتہ سے ہی نکلا۔ یہ کلکتہ ہی ہے جہاں بنگلہ اور اردو دونوں کے چھاپے کے لیے ٹائپ سیٹ پہلی بار تیار ہوئے۔ بنگلہ زبان کا پہلا اخبار 'سمباد کومدی' ۱۸۲۱ء میں تارا چند نے نکالا تھا۔ بنگلہ زبان کا دوسرا اخبار 'سماچار چندریکا' تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پڑھے لکھے بنگالیوں میں بھی اردو کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ انگریزوں کی اچھی خاصی تعداد بھی اردو سے واقف تھی۔ اس زمانے میں شرفا کی زبان فارسی تھی لیکن عوام میں بول چال کی زبان اردو تھی۔ انگریز حکام اس زمانے میں اردو زبان سیکھتے اور اس میں رابطہ قائم کرنے میں دل چسپی رکھتے تھے۔

تارا چند کلکتہ کے ایک رئیس تھے۔ ان کے نام پر کولوٹولہ اسٹریٹ سے متصل ایک روڈ کا نام بھی تارا چند اسٹریٹ رکھا گیا۔ بنگلہ زبان کا پہلا اخبار 'سمباد کومدی' ۱۸۲۱ء میں نکالا۔ چھپنے چھپانے کی کلکتہ میں سہولت مہیا تھی۔ ہری ہردت تارا چند کے بیٹے تھے۔ وہ والد کو اخبار نکالتے دیکھ رہے تھے۔ والد کے کام میں کچھ ہاتھ بھی بٹاتے ہوں گے۔ بعد میں تارا چند بنگلہ اخبار کی ملکیت بھی ہری ہردت سونپ دی تھی۔ ایسے میں ہری ہردت کی خواہش ہوئی کہ وہ اردو اخبار نکالیں۔ حسنِ اتفاق یہ ہوا کہ ہری ہردت کو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت مل گئی اور ایسا لگتا ہے کہ اخبار نکالنے کے لیے کمپنی کی معاونت بھی ملی۔ ان چیزوں سے حوصلہ پا کر ہری ہردت نے 'جام جہاں نما' کے نام سے اردو اخبار کا پہلا شمارہ ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو شائع کیا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر سدا سکھ لال تھے۔ اگرچہ جام جہاں نما کی پہلی اشاعت کا کوئی نسخہ اب تک کسی کتب خانے میں دستیاب نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کے متعدد شمارے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اسے نکالنے کی اجازت کے لیے جو درخواست گزاری گئی تھی اس کی کاپی بھی نیشنل آرکائیوز میں موجود ہے۔ عتیق صدیقی نے اس کی نقل سب سے پہلے شائع کی تھی اس کے بعد محققین نے اس کے شمارے اور اس درخواست کی اصل بھی دیکھی۔ نادر علی خاں کلکتہ منتقلی جرنل، جو مہینے بھر کے خاص مواد کو اکٹھا کر کے پیش کرتا تھا، میں لکھتا ہے:

"کلکتہ منتھلی جرنل نامی ایک اخبار کا مہینے بھر کا مواد یکجا کر کے ہر مہینے پیش کرتا تھا۔ ۱۸۲۲ء کی فائل کی جلد اول صفحہ ۲۶۵ سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

جہاں گیس ہمارے بازاروں اور چھاپہ خانوں کو روشن کرتی ہے وہاں ہمارے ہاں دیسی فلسفی بھی موجود ہیں جو ہمارے دماغوں کو منور کرتے ہیں۔ ایک سماچار کومدی' کے آسمانی نام سے مشہور ہے اور دوسرا اپنے آپ کو مکدما چار چندریکا' کے نام سے یاد کرتا ہے اور ہمارے علم کے مطابق یہ بھی آسمانی نام ہے۔ اب پچھلے دنوں ایک تیسرا فلسفی نمودار ہوا ہے جس کا نام 'جام جہاں نما' ہے۔ ہمارا ہم عصر اخبار جان بل' گزشتہ جمعہ کے شمارے میں ان تینوں کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

اس وقت کلکتہ دیسی عالموں کی نگرانی میں دو بنگالی اخبار جاری ہیں۔ ہمارے علم کے مطابق آج صبح ایک نیا اخبار ہندوستانی زبان میں جاری ہوا ہے لیکن اس کا رشتہ کس سے ہے اسے کس نے جاری کیا؟ اس کے بارے میں ہمیں کوئی کچھ بتا نہیں سکتا۔ نہ اس کا کوئی پراسپکٹس ہے نہ اس پر چھاپنے والے کا نام درج ہے۔ یہ اخبار کوارٹر سائز کے تین ورقوں پر مشتمل ہے اور اس کا نام 'جام جہاں نما' ہے۔ پہلا شمارہ بدھ کے دن ۲۷ مارچ کو شائع ہوا۔"

'جام جہاں نما' کے ایڈیٹر سدا سکھ لال تھے۔ پرنٹر اور پبلشر کا نام Hopkins Peter & Co. تھا اور یہ چپسٹ مشن پریس واقع ۱۱ سرکلر روڈ میں چھپتا تھا۔ اس کی پیشانی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا نشان شائع ہوا کرتا تھا۔

اس کے چھ شمارے اردو میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد اس کے انتظامیہ کو اس کی زبان بدلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ عوام میں تو اردو زبان بولی جاتی تھی لیکن اس وقت تک بنگال کی علمی زبان فارسی تھی۔ اس لیے اس اخبار کی اردو حلقوں میں پزیرائی کم ہوئی۔ انگریز اس کے شائق تھے اور اس اخبار کی اشاعت میں مددگار بھی لیکن عوامی مقبولیت اس وقت تک اس کے حصے میں نہ آسکی۔ اس سلسلے میں انڈو ایرانیکا میں اس اخبار کے سلسلے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں:

"ہندوستانی مقبول عام زبان ہے جو روزانہ بول چال میں زیادہ اور تحریر میں کم رائج ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانیوں میں اخبار بینی کا ذوق بہت کم ہے یا شاید صرف ان افراد تک محدود ہے جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے جہاں کا کوئی اخبار ان لوگوں کے تعاون کی توقع نہیں کرسکتا جو صرف ہندوستانی ہی جانتے ہیں اور جن لوگوں کو بہتر مواقع میسر ہیں وہ فارسی زبان کے اخبار کو ترجیح دیتے ہیں کیوں کہ فارسی ہر اس شخص کی تعلیم کا جزو ہے کہ کسی بھی درجے میں اپنی فضیلت اور برتری کا مدعی ہے ہمارا گمان ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ اور جاہل لوگوں میں اپنی برتری کا اس درجہ احساس ہے کہ وہ عوام الناس کی زبان استعمال کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔"

(انڈو ایرانیکا، ۱۹۴۷ء ص ۱۸)

۲۸ مئی ۱۸۲۲ء کے کلکتہ جرنل اس سلسلے میں ایک خبر ملتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:

"جس ہندوستانی اخبار کے چھ شمارے چھپ چکے ہیں اس کی زبان میں اہم تبدیلی ہونے والی ہے۔"

ایسا شاید اس لیے بھی ہوا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کی اعانت سے منہ موڑ لیا تھا۔ اخبار مالی خسارے سے دوچار ہوا۔ اینڈریو اسٹرلنگ نے ہندوستانی اخبارات کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کی تھی۔ اس میں جام جہاں نما کے بارے میں لکھا ہے:

"رہا اخبار جام جہاں نما اس کا چندہ بھی حکومت نے بند کر دیا ہے اور جہاں تک کاغذ اور چھاپ کا تعلق ہے اس کی حالت پہلے سے گر گئی ہے اور اس کی زندگی کا انحصار میرے جیسے چند انگریزوں کی سرپرستی پر ہے، جو اخبار کی اشاعت کو اہمیت دیتے ہیں تاکہ ہندوستان میں علوم وفنون کی اشاعت و ترویج ہو سکے۔ موجودہ حکومت میں مقامی باشندے اخبارات پر خرچ کرنا فضول خرچی تصور کرتے ہیں اسی لیے جام جہاں نما کی کوئی طلب نہیں ہے چنانچہ یہ اخبار فروخت نہیں ہوتا چوں کہ حکومت اور عوام اس کے تعاون سے دست کش ہیں اس لیے مالک اخبار کو اجراے

اخبار کے لیے آمدنی کے دوسرے ذرائع اختیار کرنا پڑتے ہیں۔"

وسائل کی کمی نے جام جہاں نما کے انتظامیہ کو مجبور کر دیا کہ وہ اخبار کی زبان بدلیں اور اسے فارسی زبان میں شائع کیا کریں۔ چنانچہ چھ شماروں کے بعد اس کی زبان بدل دی گئی۔ اس سلسلے میں اخبار کی جانب سے ایک اعلان شائع کیا گیا کہ آئندہ شمارے سے اس اخبار کی زبان فارسی ہوگی۔

Indo Iranica میں، جس کا ذکر اوپر ہوا 'جام جہاں نما' پر ایک مضمون دسمبر ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں جام جہاں سے ایک اشتہار درج کیا گیا ہے۔ یہ اشتہار کئی شماروں میں چھپتا رہا۔ اس کا بیان دیکھیے:

"مدیر جہاں نما نہایت ادب کے ساتھ یہ امر عوام کے گوش گزار کرتا ہے کہ اخبار کے علاوہ سوداگیں یورپی طبقے کے تھے اخبار کو زیادہ دل چسپ پر لطف اور مفید بنانے کی غرض سے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ آئندہ اس اخبار کا ضمیمہ خالص ہندوستانی یا اردو زبان میں شائع کرے اگر اسے فارسی اخبار کے ساتھ خریدا جائے تو اس کا چندہ چار آنے فی پرچہ یا ایک روپیہ ماہانہ ہوگا لیکن اگر صرف اردو ضمیمہ خریدا جائے تو چندہ دو روپیہ ماہانہ ہوگا۔"

(انڈو ایرانیکا دسمبر ۱۹۳۷ء ص ۱۸)

۲۳ مئی ۱۸۲۳ء کو جام جہاں نما کا پھر سے اردو ایڈیشن جاری کیا گیا اور اسے ضمیمہ کا نام دیا گیا۔ کہنے کو یہ فارسی جام جہاں نما کا ضمیمہ تھا لیکن یہ الگ سے نکالا جاتا تھا۔ اور اپنے آپ میں خود مکتفی تھا۔ تاہم یہ بھی زیادہ برسوں تک نہ چل سکا۔ ۲۳ جنوری ۱۸۲۵ء کے شمارے میں اردو ضمیمہ کے بند ہونے کا اعلان ملتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ شائع ہوتا رہا لیکن اس کی زبان فارسی رہی۔ یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء کے شمارے میں اردو ضمیمے کے بند ہونے کی خبر ملتی ہے۔ اخبار لکھتا ہے:

"اس لحاظ سے کہ بجز سے قدر شناس جنھوں کی لطف گستری سے اس کاغذ نے رونق اور شہرت پائی اردو عبارت سے ذوق نہیں رکھتے اور اہل ہند جنھوں کی زبان ہے وہ فارسی تحریر چاہتے ہیں خاکسار نے مناسب سمجھا کہ آئندہ ہفتے سے ہندی فرمان کے عوض ایک فرمان اور بھی فارسی میں لکھا جائے، جس میں اس اخبار کے پڑھنے والے خوشی سے پڑھیں اور یہ کاغذ مسدود پائے اور خریداروں کے لیے کوئی رنج نہیں۔ آج تک آٹھ صفحے فارسی اور چار اردو کے چھپتے تھے آئندہ سے بارہوں صفحے فارسی میں چھاپے جائیں گے اور تین روپے ماہوار بدستور رہیں گے۔"

(اخبار جام جہاں نما اردو، یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء)

اس طرح اردو جام جہاں نما کی زندگی کل چار سال تک ہے۔

جام جہاں نما میں خبروں کے ساتھ شعری حصہ بھی شائع ہوا کرتا تھا۔ مقامی خبریں بھی ہوتی تھی اور دور دراز کی خبریں بھی۔ خبروں کے تعلق سے ذیلی عنوانات لگائے جاتے تھے۔ مثلاً "شاہ جہاں آباد کی خبر، لکھنؤ کی خبر، لاہور کی خبر" ستی کی خبر، دھوئیں کا جہاز (بھاپ سے چلنے والے جہاز سے متعلق خبر) وغیرہ۔ لکھنؤ سے اگر دو الگ الگ خبر ہے تو لکھنؤ کی خبر کا عنوان بھی دوبار درج تھا۔ یہاں مثال کے طور پر ایک مقامی خبر کی تفصیلات دیکھیے:

"جام جہاں نما میں بعض بڑی دلچسپ، معلوماتی اور تاریخی اہمیت کی حامل خبریں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ۲۹ دسمبر ۱۸۲۲ کے جام جہاں نما میں مرزاپور (کلکتہ) کے ایک درس گاہ کے امتحان سے متعلق خبر شائع ہوئی ہے جو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مخصوص تھی۔ اس زمانے میں ایسی درس گاہ کا وجود ہی اپنے آپ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن سب سے حیرت انگیز اور سبق آموز نکتہ یہ ہے کہ اس درس گاہ میں کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ دست کاری کا فن بھی طالبات کو سکھایا جاتا تھا۔"

اس خبر سے جام جہاں نما کی زبان کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ جملے درست اور چست ہونے کے ساتھ ساتھ سہل بھی ہیں۔ اس خبر سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تعلیم سے بڑی دل چسپی تھی۔ اس اخبار میں فیچر اور کتابوں کے ترجمے بھی شامل کیے جاتے تھے۔ ان فیچروں میں ہندوستانی کے معاشرتی زوال پر بھی انگشت نمائی ملتی ہے۔ ان فیچروں سے اندازہ ہوتا کہ اس زمانے بھی بے روزگاری عام تھی، نوابین عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے، بردہ فروشی عروج پر تھی۔ شکم کے دوزخ کو بھرنے کے لیے لوگ اپنے لخت جگر کو بھی بیچ دیا کرتے تھے۔ ایسی ایک خبر جام جہاں نما اردو کے یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء کے شمارہ میں دیکھیے۔

"ایک دن صبا بیگ کوتوال نے کو حکم دیا کہ جتنی لونڈیاں شہر میں ہیں انھیں حضور کی ڈیوڑھی پر حاضر کیا کرو۔"

(اخبار جام جہاں نما اردو، یکم اکتوبر ۱۸۲۵ء)

ایک دوسرے شمارے میں لکھا ہے:

"ایک وضع پہنچی کہ احسان علی بردہ فروش چار کنیز لایا ہے اور اس نے آٹھ کنیزیں مرزا سیتا بیگ کوتوال کو بیچی تھیں وہ بھی در دولت پر حاضر ہے۔ ارشاد ہوا کہ ارشاد علی کے پاس روانہ کرو وہ جو کنیزیں کوتوال کے پاس آئی تھیں ان میں تین بہت چھوٹی عمر کی تھیں، ان کو مستر د کر دیا گیا۔"

(اخبار جام جہاں نما اردو، ۲۳ مارچ ۱۸۲۵ء)

یہ اقتباسات صرف اخبار کی خبریں نہیں، معاشرے کے کوائف کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ اس اخبار میں تاریخی مضامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد شعر و سخن کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ تاریخ انگلستان قسط وار شائع کیا جاتا رہا۔ اس کے بعد حیات نپولین قسط وار شائع کیا جانے لگا۔ آخر میں تاریخ عالم گیر کا ترجمہ شائع ہونے لگا۔ اس میں شامل ہونے والی خبروں اور فیچر کے بارے میں عبدالسلام خورشید اپنی کتاب صحافت پاکستان و ہند میں لکھتے ہیں:

"کبھی کبھار ایک آدھ غزل چھاپ دی جاتی تھی۔ خبروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ دیسی ریاستوں کے قلمی خبر ناموں سے اخذ کی جاتی تھیں۔ اور زیادہ تر مقامی انگریزی اخبارات سے ترجمہ اور تلخیص کر لی جاتی تھیں۔ چوں کہ یورپی قارئین اس اخبار کو اردو زبان میں مہارت حاصل کرنے کے لیے پڑھتے تھے اور خبروں کے مطالعہ کے لیے انگریزی جرائد کو ترجیح دیتے تھے اس لیے یکم مارچ ۱۸۲۶ سے اردو اخبار میں خبروں کی اشاعت تقریباً بند ہوگئی اور چار مہینے تک بالاقساط تاریخ انگلستان درج کی گئی۔ پھر تقریباً ایک برس تک محاربات نپولین کی داستان درج ہوتی رہی۔ ۱۷ رجون ۱۸۲۷ء سے ۲۳ر جنوری ۱۸۲۸ تک تاریخ عالمگیری کا ترجمہ چھپتا رہا۔"

(صحافت پاکستان و ہند میں ۳۸)

"جام جہاں نما اردو کا پہلا اخبار ہے، لیکن اس نے اردو زبان میں خبر نگاری کی ایک مثال قائم کی۔ پہلے پہل تو یہ کمپنی کے دباؤ میں رہا۔ کمپنی نے جب مالی اعانت دینا بند کر دیا تو کمپنی کے معاملات پر بھی انگشت نمائی کرنے لگا۔ آگے چل کر اس کا اپنا پریس بھی قائم ہو گیا۔ اپنے زمانے میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس شہرت کی وجہ سے اس نام سے کئی اخبار نکلے۔ بعض محققین نے اس نام سے نکلنے والے کئی اور اخبارات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک اخبار جام جہاں نما کے نام سے ہی خانقاہ شریف لین سے نکلنے کا ذکر اختر شاہی نے کیا ہے۔

جام جہاں نما اردو کا صرف اخبار ہی نہیں یہ رجحان ساز اخبار بھی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یہ اخبار ایک بنگالی نے نکالا۔ اس کے ایڈیٹر سدا سکھ لال تھے۔ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والے نادر علی خان نے انہیں مرزا پوری لکھا ہے۔ یہ مرزا پور کلکتے ہی کے ایک محلہ کا نام ہے جو سیالدہ کے قریب ہے۔ یہ مرزا پور کے نام سے ہی آج بھی موجود ہے اور کتاب سازی اور اخبارات کے لیے یہاں ضروری سامان یہاں دستیاب ہوتا ہے۔ کاغذ کی فراہمی ہو یا طباعت کے لیے دوسرے ساز و سامان یا جلد سازی کا مسئلہ، یہ اس کا ایک مرکز ہے۔

ایک اور اہم بات جو قابل غور ہے یہ ہے کہ اس زمانے میں ایک بنگالی شخص اردو کا اخبار نکال رہا۔ اس سے اس زمانے اردو زبان کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

☆☆☆

Dr. Dabir Ahmed
Associate Professor
& Head Dept t. of Urdu
Maulana Azad College
Rafi Ahmad Kidwai Road,
Kolkata - 700016
Mobile:9433078802

توجہ طلب

1- بینک اکاؤنٹ کی معرفت زر تعاون ادا کرنے والے خریدار payment slip کی تصویر اور اپنا پورا پتہ اکاڈمی کو ضرور بھیجیں تاکہ ان کا نام خریداروں کی فہرست میں شامل کر لیا جائے۔

2- اپنی تخلیقات / نگارشات Inpage نستعلیق میں، غلطیوں سے پاک (پروف بار بار پڑھا ہوا) نسخہ درج ذیل پتہ پر میل کریں:
sahmahiroohedab@gmail.com

مقالے / تخلیقات کے نیچے پورا پتہ، موبائل نمبر، بینک اکاؤنٹ کی تفصیل اور بینک میں درج نام ضرور لکھیں۔

"روح ادب" کو بھیجی گئی تخلیقات / نگارشات کسی دوسرے رسالے یا اخبار کو نہ بھیجی جائیں۔

UPA
IMPACT FACTOR 5.473(SJIF)
UPA NATIONAL E-JOURNAL
Interdisciplinary Peer-Reviewed IndexedJournal
Volume -8 : Issue-1 (February-2022)
ISSN 2455-4375

اکیسویں صدی میں اردو زبان فروغ و امکان

آج ہم اکیسویں صدی میں سانس لے رہے ہیں جو بلاشبہ سائنس اور ٹکنالوجی کی صدی ہے۔ پوری دنیا اسمارٹ فون، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی دیوانی ہے۔ سائنس کے ان حیرت انگیز ایجادات نے نہ صرف سبھی کو متحیر کر دیا ہے بلکہ ایک جگہ یکجا کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہم انٹرنیٹ کے ایک کلک کے ذریعہ سارے عالم کی معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ اس صدی نے ابھی صرف دو دہائی کا ہی سفر طے کیا ہے۔ لیکن کئی وجوہات کی بنا پر اس قلیل عرصے ہی میں اس صدی نے ہمیں کافی متاثر کیا ہے۔ اس صدی نے جہاں ایک جانب حیرت انگیز انکشافات کے ذریعہ لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا وہیں دوسری جانب کرونا جیسی وبا نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان جتنی بھی چاہے ترقی کر لے لیکن قدرت کے سامنے آج بھی وہ مجبور و لاچار ہے۔

اکیسویں صدی اور کرونا وائرس نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ انسان کی سماجی، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی زندگی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ جب دنیا کی ہر شئے ان چیزوں سے متاثر ہو رہی ہے تو پھر زبان و ادب تو سماج کا آئینہ ہے۔ اور ادیب سب سے زیادہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ پھر ان ہونے والی تبدیلیوں سے کوئی ادب یا ادیب متاثر ہوئے بغیر کس طرح رہ سکتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کا اثر ادب اور ادیب براہ راست قبول کرتے ہیں۔ اور جب پورا سماج ہی مختلف مسائل سے نبرد آزما ہو تو پھر کسی زبان و ادب کا ان حالات سے متاثر ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ اور اردو زبان کی پیدائش بھی تو سماجی ضرورتوں کے تحت ہوئی ہے۔

اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے۔ ہر زبان کا کسی نہ کسی تہذیب سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ لیکن اس معاملے میں ہماری پیاری زبان اردو کا معاملہ بالکل ہی جدا ہے۔ کیوں کہ اردو زبان کا ذکر چھڑتے ہی اسے ہم زبان کی بجائے تہذیب کا درجہ دیتے ہیں۔ میرے خیال سے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان کا تعلق کسی ایک خاص علاقے سے ہوتا ہے۔ اور وہ زبان اس علاقے کی تہذیبی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال ہمارا ملک بھارت ہے۔ اس ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اور وہ زبان اس علاقے کی تہذیبی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ لیکن اردو نہ صرف برصغیر بلکہ دیگر ممالک میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا اردو کسی ایک تہذیب کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ یہ مختلف تہذیبوں کا مجموعہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب بھی اردو کا ذکر ہوتا ہے تو زبان اور تہذیب کا فرق ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ کیوں کہ اردو اب کسی ایک علاقے کی زبان نہیں بلکہ عالمی زبان بن چکی ہے۔ زبان کا تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں ہوتا ہے اور اردو کی یہ بڑی خوبی ہے کہ یہ نہ صرف سیکولر مزاج رکھتی ہے بلکہ ہر رنگ میں ڈھل جانے کے ہنر سے بھی واقف ہے۔ اس لیے جہاں اکیسویں صدی میں کئی زبانیں اپنا وجود بچانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں وہیں اردو زبان نہ صرف ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا رہی ہے بلکہ عالمی سطح پر اپنا حلقہ مزید وسیع کر رہی ہے۔ اور اس کی مثال اردو کی نئی بستیوں کا وجود میں آنا ہے۔

تقسیم ہند کا اثر ہر چیز پر ہوا لیکن اس سے سب سے زیادہ متاثر اردو زبان ہوئی۔ جہاں اسے پڑوسی ملک میں قومی زبان کا درجہ حاصل ہوا وہیں اسے اپنے ملک میں صرف ایک ووٹ کی وجہ سے قومی زبان کے درجے سے محروم ہونا پڑا۔ آزادی سے قبل تک جس زبان کو رابطے کی زبان کی حیثیت حاصل تھی اسے تعصب کا شکار ہونا پڑا۔ آزادی کے بعد جو سہ لسانی فارمولا اپنایا گیا اس کے مطابق ہر صوبائی زبان کو اپنے صوبوں میں صوبائی زبان کا درجہ ملا۔ لیکن افسوس کہ اردو جو کہ نہ صرف پورے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ پورے ملک میں رابطے کی زبان بھی بنی تھی اسے کسی بھی صوبے کی زبان کا درجہ نہیں ملا۔ اس زبان کے ساتھ اس قدر تعصبانہ رویہ اپنایا گیا کہ اس زبان کو ایک خاص مذہب اور فرقے سے جوڑ دیا گیا۔

اکیسویں صدی سائنس اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ اس صدی میں اسی زبان کا وجود باقی رہے گا جو خود کو مکمل طور پر انفارمیشن اور ٹیکنالوجی سے لیس کرے گی۔ وقت اور حالات کے مطابق اردو زبان کو بھی خود کو مکمل طور پر جدید ٹکنالوجی سے لیس کرنا ہوگا۔ مکمل طور پر نہ سہی لیکن ضرورت کے مطابق ہمیں بھی اپنی زبان کو جدید ٹکنالوجی سے جوڑنا ناگزیر ہے۔ آج اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے مختلف ایپس، سائٹس، یوٹیوب چینل، یونی کوڈ کا استعمال بخوبی کیا جا رہا ہے۔ اردو کی کتابیں، اخبارات و رسائل، آن لائن پی۔ ڈی۔ ایف اور یونی کوڈ کی شکل میں آسانی سے دستیاب ہیں۔ کرونا سے سیاسی، معاشی، تعلیمی اور جانی و مالی نقصان ہوا ہے۔ لیکن اس وبا نے اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ کیوں کہ وہ اخبارات و رسائل، جو اس وبا سے قبل تک صرف آف لائن شائع ہوا کرتے تھے وہ بھی آن لائن شائع ہونے لگے۔ سیمینار کی جگہ ویبینار نے لے لی، لائیو پروگرام ہونے لگے، آن لائن کلاسیں، مشاعرے، ادبی نشستیں بھی آن لائن ہونے لگیں۔ وہ اردو داں حضرات جو اب تک خود کو ٹیکنالوجی سے محفوظ کیے ہوئے تھے ان لوگوں نے بھی نہ صرف اسے سیکھا بلکہ آج بخوبی اس کا استعمال کر رہے ہیں۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے سب سے پہلے ہمیں خود اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا ہوگا۔ اردو کی بنیادی تعلیم کو عام اور مضبوط کرنا ہوگا۔ بچوں کے لیے اسکول، مکتب، مدرسہ اور گھروں میں اردو زبان کی تعلیم کے لیے معقول انتظامات کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ہمیں فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے بچوں کے لیے ایسے اسکول کا انتخاب کریں جہاں اردو کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہو۔ اگر کسی وجہ سے ایسے اسکول نہیں ملتے ہیں تو ہمیں اپنے گھروں میں اردو زبان کی تعلیم کے لیے معقول انتظام کرنے ضرور کرنا چاہیے تاکہ ہماری اولادیں اپنی تہذیب سے نابلد نہ رہ جائیں۔

ہر زبان کی شناخت اس کا رسم الخط ہے۔ اگر کسی زبان کو مکمل طور پر ختم کرنا ہو تو آپ کو زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں صرف اس کا رسم الخط تبدیل کر دیجیے وہ زبان اپنی موت آپ مر جائے گی۔ ترکی زبان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس لیے اردو زبان کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ اس کے رسم الخط کو نہ صرف عام کیا جائے بلکہ نئی نسل میں منتقل کیا جائے۔ کیوں کہ اردو روز بروز صرف بولنے کی زبان بنتی

IMPACT FACTOR
5.473(SJIF)

UPA NATIONAL E-JOURNAL

Interdisciplinary Peer-Reviewed IndexedJournal

Volume -8 : Issue-1 (February-2022)

ISSN
2455-4375

جاری ہے۔ اس کا دائرہ کار محدود ہوتا جارہا ہے۔ آج ہمارے گھروں میں اردو صرف بول چال کی زبان بنتی جارہی ہے۔ ہماری نئی نسلیں اردو اور ہندی کے فرق سے بھی نابلد ہیں۔ وہ اردو میں بات کرتے ہیں اور اسے ہندی کا نام دیتے ہیں۔ آج تمام تر سہولتیں میسر ہونے کے باوجود آج ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو واٹس ایپ، فیس بک، ٹیلیگرام یا دیگر سوشل سائٹس یا ایپس پر اردو رسم الخط کا استعمال کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر اردو رسم الخط کا استعمال کرنے والے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا اکثر لوگ اردو لکھنے کے لیے رومن رسم الخط کا استعمال کر رہے ہیں۔

اکیسویں صدی اردو زبان کے لیے اس معنوں میں بہتر ہے کہ دوسری زبان والوں کی طرح اردو والے بھی اپنی زبان کو بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو پوری کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اردو میں شعر و ادب کے ساتھ دوسرے علوم و فنون پر بھی خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی زبان میں شعر و ادب کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرے علوم جیسے سائنس، انفارمیشن ٹیکنالوجی، لسانیات، سماجیات، معاشیات، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، صحافت وغیرہ جیسے موضوعات پر اردو میں بہت ہی کم کتابیں دستیاب ہیں۔ اس لیے اردو والوں اور خاص طور پر اردو اداروں کو اس جانب خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے لیے بھی اردو زبان میں مواد کی دستیابی ضروری ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو اخبارات و رسائل بھی کثیر تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے کتنے اخبارات ہیں جو صحافت کے معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ اگر کچھ میں یہ خوبیاں پائی بھی جاتی ہیں تو ان کا تعلق کسی نہ کسی خاص نظریے سے ہوتا ہے۔ اور وہ اپنا بیشتر وقت اسی پروپگنڈے میں صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ اکثر اردو اخباروں کی یہ حالت ہے کہ ان کی خبروں کی پیشکش کا انداز ایسا ہوتا ہے گویا وہ ایک خاص طبقے کا جذباتی استحصال کر رہے ہیں۔ بعض اردو اخبارات کی حالت ایسی ہے کہ سرکاری اشتہار کا وہ اردو ترجمہ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ اور انھیں حکومت وقت سے اشتہار جس زبان میں ملتا ہے اسے میں شائع کر کے اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اردو اخبار کا سرکولیشن بھی بہت کم ہے کیوں کہ اردو والے اخبار خرید کر پڑھنے کی بجائے مفت کے اخبار کو فوقیت دیتے ہیں۔ اگر اردو رسائل کی بات کریں تو یہ بھی اچھی خاصی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر ادبی اور مذہبی رسائل ہوتے ہیں۔ لیکن خریداروں کی کمی کی وجہ سے ان کا سرکولیشن بھی بہت کم ہے۔ دیگر موضوعات یا علوم پر اردو رسائل خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ اس لیے ادبی اور مذہبی موضوعات کے علاوہ دیگر علوم اور موضوعات پر رسائل شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ بچے قومی اثاثہ ہوتے ہیں اس لیے ان کی ذہنی آبیاری کے لیے ادب اطفال پر بھی معیاری رسائل جاری کرنا وقت کی اہم ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ ان سب باتوں سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ جو اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں نہ صرف ان کے قارئین کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی جائے بلکہ ان کے خریداروں کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ کرنے کی سعی کی جائے۔ اردو اخبارات اور رسائل کی دکانیں روز بروز بند ہوتی جارہی ہیں کیوں کہ ان کے خریدار ناپید ہوتے جارہے ہیں۔

IMPACT FACTOR 5.473(SJIF)

UPA NATIONAL E-JOURNAL

Interdisciplinary Peer-Reviewed IndexedJournal

Volume -8 : Issue-1 (February-2022)

ISSN 2455-4375

اکیسویں صدی کا سب سے اہم مسئلہ روزگار کا ہے۔ کرونا جیسے وبائی مرض اور لاک ڈاؤن کے بعد روزگار کا مسئلہ مزید پیچیدگیاں اختیار کر چکا ہے۔ والدین کو ہمیشہ یہ بات ستاتی ہے کہ ہمارا بچہ اردو کی تعلیم حاصل کر کے کہیں ان بچوں سے پچھڑ نہ جائے جو دوسری زبانوں کے ذریعہ جدید تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور اس طرح سے کہیں ہمارے بچے اچھی ملازمت سے محروم نہ رہ جائیں۔ لیکن یہ صرف اردو والوں کی منفی سوچ اور احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ اردو پڑھنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ ہمارے بچے کوئی دوسری زبان یا مضمون نہیں پڑھیں۔ اردو پڑھنے والوں کے ساتھ یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ایک وقت تین زبانیں پڑھتے ہیں۔ مادری زبان کے طور پر اردو زبان، دوسری زبان کے طور پر انگریزی زبان اور ساتھ میں ایک ریاستی زبان پڑھتے ہیں۔ اگر ہم تینوں زبانوں میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں تو ترجمہ نگاری کے میدان میں تو ہمیں کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔ آج کے دور میں سرکاری اور غیر سرکاری اداروں، ایجنسیوں میں ترجمہ نگار کی بہت ضرورت ہے۔ اردو زبان ہمیشہ روزگار حاصل کرنے میں معاون و مددگار ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا قومی امتحان ہو یا ریاستی امتحان میں اردو کا پرچہ بھی شامل رہتا ہے۔ جو ہمارے لیے نہ صرف امتحان میں کامیاب ہونے میں معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ ہمارے میرٹ کو بھی بہتر بناتے ہیں۔ ہمارے ملک کا سب سے بڑا امتحان انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس (آئی۔اے۔ایس) ہے۔ اس امتحان کے تمام پرچے آپ اردو میں لکھ کر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہمارے سامنے دھولیہ (مہاراشٹر) کے عاصم خاں کی مثال موجود ہے جس نے سول سروس کے امتحان کے تمام پرچے اردو میں لکھ کر ہی ایک آئی۔اے۔ایس۔ آفیسر بنا۔ ماہرین تعلیم کی تحقیق سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ دوسری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے کے مقابلے میں مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے زیادہ کامیاب و کامران ہیں۔ اس صدی میں اردو میں بھی روزگار کے مواقع بڑھتے جا رہے ہیں۔ نجی اداروں میں ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات و رسائل، الکٹرانک میڈیا یا اشاعتی اداروں، تعلیمی اداروں میں بھی اردو جاننے والوں امیدواروں کے لیے اچھے مواقع ہیں۔ سرکاری اداروں میں بھی پہلے کے مقابلے زیادہ ملازمت کے مواقع پیدا ہو رہے ہیں۔ اردو ٹائپنگ، اردو شارٹ ہینڈ اور کمپیوٹر آپریٹر کے طور پر بھی روزگار کے اچھے مواقع ہیں۔ آج ہمیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم احساس کمتری سے باہر نکلیں۔ ہم یہ سوال نہ قائم کریں کہ ہم اردو پڑھ کر کیا کر سکتے ہیں بلکہ ہمیں یہ سوال قائم کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم اردو پڑھ کر کیا نہیں کر سکتے ہیں۔

اردو کے فروغ کے امکانات تبھی روشن ہو سکتے ہیں جب ہم خود اردو والے اردو کے تعلق سے بیدار ہو جائیں۔ حکومت اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے جتنے بھی اقدامات کرے لیکن اہل زبان کی جذباتی وابستگی اور کوشش کے بغیر اردو زبان کا فروغ مشکل ہے۔ ہم اردو والوں کو زبان کے فروغ کے لیے ایک دوسرے کا "گلا" کرنے کی بجائے ہم سے انفرادی یا اجتماعی طور پر ہم سے جتنا بھی ہو سکے عملی طور پر ضرور کرنا چاہیے۔ آج کل ایک اصطلاح "اردو والے" عام ہو رہے ہیں۔ آخر یہ اردو والے کون ہیں؟ اس تعلق سے پروفیسر فضل اللہ مکرم لکھتے ہیں

" اردو زبان کے اتنے مسائل نہیں ہیں جتنے اہل زبان کے مسائل ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ آج

IMPACT FACTOR 5.473(SJIF)

UPA NATIONAL E-JOURNAL

Interdisciplinary Peer-Reviewed IndexedJournal

Volume -8 : Issue-1 (February-2022)

ISSN 2455-4375

صرف اردو ٹیچر، لیکچرار اور پروفیسرز ہیں۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں۔ اردو والوں سے مراد وہ تمام لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کچھ احباب اردو میں سائنس اور سماجی علوم پڑھاتے ہیں مگر خود کو اردو والا نہیں سمجھتے۔۔۔۔۔! اس خام خیال کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم خود کام نہیں کرتے مگر کام کرنے والوں کو للکارتے ہیں۔۔۔ اپنے کام دوسروں کے نام کر دیتے ہیں۔ جب تک ہم اپنی زبان اردو کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک ہم اردو تہذیب و ثقافت سے علیحدہ ہونا خود کی شناخت اور انفرادیت کو ختم کرتا ہے۔ اردو زبان ہے تو ادب ہے اور تہذیب و ثقافت ہے اور ہماری شناخت ورنہ کچھ نہیں۔"

(قومی زبان: اکتوبر 2020، صفحہ ۸،۷)

آج اگر ہمیں اردو زبان اور ہماری تہذیب کو زندہ رکھنا ہے تو اس کے لیے نہ صرف بیدار ہونے کی ضرورت ہے بلکہ اس سے عشق کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا عشق جس میں جس میں صرف لٹانے کی فکر ہو اور پانے کی کوئی تمنا نہ ہو۔ اردو زبان سے ہمارا عشق اس دلت مراٹھی عورت جیسا ہو جو پڑھی لکھی نہ ہونے کے باوجود صرف اپنی زبان کی حفاظت کے لیے باقاعدہ مراٹھی اخبار خریدتی تھی۔ جس کا ذکر مشہور عالم دین مولانا عبدالکریم پاریکھ نے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"ان کے گھر میں صفائی کرنے والی ملازمہ دلت تھی۔ ایک دن وہ دلت سماج کا تازہ مراٹھی اخبار لے کر آئی۔ میں نے پوچھا کہ کیا تم پڑھنا جانتی ہو؟ اس نے کہا نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر تم یہ اخبار کیوں لائی ہو؟ وہ بولی کہ میں اسے خریدتی ہوں، یہ میری قوم کا اخبار ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک دلت عورت پڑھی لکھی نہ ہونے کے باوجود اپنی زبان اور قوم کی ترقی کے تعلق سے کس قدر فکر مند ہے۔ لیکن یہ ذوق و شوق ہم اردو والوں میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔ اس لیے اگر ہم اپنی زبان، قوم اور تہذیب کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں خود فکر مند ہونا چاہیے۔ اور پابندی سے اخبارات و رسائل خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

UPA NATIONAL E-JOURNAL
Interdisciplinary Peer-Reviewed IndexedJournal
Volume -8 : Issue-1 (February-2022)
IMPACT FACTOR 5.473(SJIF)
ISSN 2455-4375

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے فروغ کو مزید بہتر کرنے کے لیے نہ صرف ذاتی طور پر کوشش کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ہمیں مستقبل کے لیے لائحہ عمل بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر ہم کون کون سے اقدامات کریں جس سے اردو زبان کے فروغ کے امکانات مزید روشن ہو جائیں۔ میرے خیال سے اگر مندرجہ ذیل نکات پر توجہ دی جائے تو اردو کا مستقبل ضرور تابناک ہو سکتا ہے۔

پرائمری سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کی سہولت کا کا انتظام اردو زبان میں ہونی چاہیے۔

اردو کے لیے جو نصاب تیار کیا جائے اس میں موجودہ زمانے کی ضروریات اور جدید انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی کے مطابق مواد ہونا چاہیے۔

اردو کی نئی بستیوں کی نشاندہی کرکے اس کی رہنمائی کی جائے۔

ہر شہر، گاؤں اور قصبہ میں اردو کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے۔

اردو زبان میں فاصلاتی نظام تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔

مقابلہ جاتی امتحانات کی تیاری کے لیے اردو زبان میں بھی کتابیں دستیاب کرائی جائیں۔

عام لوگوں کو اردو سے جوڑنے کے لیے اردو میں شعر و ادب کے علاوہ معلومات عامہ کے موضوع پر بھی کتابوں کی اشاعت ہونی چاہیے۔

شکوہ شکایت کا ہے ہمیں اپنے گھروں میں اردو کا ماحول تیار کرنا ہوگا تاکہ بچوں کے اندر اوائل عمری سے ہی اردو سے جذباتی لگاؤ پیدا ہو۔
اور یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ آج کل ایک اصطلاح "اردو والے" سے مراد

ہمیں اپنے گھروں میں پابندی سے اردو اخبارات، رسائل منگوانا چاہیے۔ خاص طور پر ان میں بچوں کے رسائل بھی شامل ہونے چاہئیں
بچوں کے اندر ابتدائی عمر سے ہی اردو سے دلچسپی پیدا ہو سکے۔ تاکہ

اردو کے فروغ کے لیے انٹرنیٹ میڈیا اور سوشل میڈیا وغیرہ کا استعمال بکثرت کرنا چاہیے۔

اردو کے فروغ کے لیے نئے ویب سائٹس اور ایپس کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس دور کے بچے موبائل فون کے بہت زیادہ شوقین ہیں اس لیے ان کی دلچسپی کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان بچوں کے لیے اردو زبان میں بھی پروگرام بنانے چاہیے۔

وقت اور حالات کے مطابق اردو کی تمام چیزوں کو ڈیجیٹلائز کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

پی۔ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالرس کے لیے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے دوران تحقیق کم از کم دو سیمینار اور دو تحقیقی مقالوں کو ریسرچ جرنل میں اشاعت ضروری قرار دیا ہے۔اسی طرح خاص طور سے ان ریسرچ اسکالرس، جنہیں اسکالرشپ مل رہے ہیں۔ان کے لیے چند اخبار ور سائل کی ممبرشپ بھی لازمی کیا جاسکتا ہے۔

محمد منظر حسین (MD MANZAR HUSSAIN)

اسسٹنٹ پروفیسر (Assistant Professor)

پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو (P.G. Deratment of Urdu)

مولانا آزاد کالج، کولکاتا (Maulana Azad College, Kolkata)

e-mail: mdmanzarhussain@gmail.com

Mobile No.: 9883874711

سہ ماہی

ادبی نشیمن

لکھنؤ

جون تا نومبر ۲۰۲۳ء

ADBEE NASHEMAN

رباعی نمبر

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

قیمت ۵۰۰ روپے

Vol: 6, Issue: 03,04
June. to November.2023

Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
Lucknow - 226003

RNI No. UPURDU /2017/74845
Per Copy :200/-
Biannaul Subscription :300/-

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
A Central University under Ministry of Education
Government of India

G20

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم

داخلہ اعلامیہ۔ تعلیمی سال 2023-24

جولائی۔اگست 2023 سے شروع ہونے والے تعلیمی سال 2023-24 میں مندرجہ ذیل فاصلاتی طریقہ تعلیم کے پروگراموں میں داخلے کے لیے آن لائن درخواستیں مطلوب ہیں:

1۔ ایم اے (اردو)
2۔ ایم اے (ہندی)
3۔ ایم اے (انگریزی)
4۔ ایم اے (عربی)
5۔ ایم اے (تاریخ)
6۔ ایم اے (اسلامیات یا اسلامک اسٹڈیز)
7۔ بیچلر آف آرٹس (بی۔اے)
8۔ بیچلر آف کامرس (بی۔کام)
9۔ بیچلر آف سائنس (بی ایس سی) (لائف سائنسز)
10۔ بیچلر آف سائنس (بی۔ایس۔سی) (فیزیکل سائنسز)
11۔ بیچلر آف ایجوکیشن (بی۔ایڈ)
12۔ ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن
13۔ ڈپلوما ان ٹیچ انگلش
14۔ ڈپلوما ان ارلی چائلڈ ہوڈ کیئر اینڈ ایجوکیشن
15۔ ڈپلوما ان اسکول لیڈرشپ اینڈ مینجمنٹ
16۔ سرٹیفکیٹ کورس اہلیت اردو بذریعہ انگریزی
17۔ سرٹیفکیٹ کورس فنکشنل انگلش

ای پراسپکٹس اور آن لائن درخواست فارم ویب سائٹ manuu.edu.in/dde داخلہ پورٹل manuuadmission.samarth.edu.in پر دستیاب رہیں گے۔مندرجہ بالا پروگرامس میں داخلے کے لیے درخواست فارم پراسپکٹس 2023-24 کے مطابق دی گئی رجسٹریشن فیس کے ساتھ جمع کرنا ہوگا اور اسناد کی تصدیق کے بعد پروگرام فیس کی ادائیگی کرنی ہوگی۔

امیدوار مزید تفصیلات کے لیے طلبہ رہبری یونٹ ہلپ لائن **040-23008463** اور **040-23120600 (2208&2207)** پر صبح 9 بجے سے شام 7 بجے تک رابطہ کر سکتے ہیں۔ان کے علاوہ مزید تفصیلات کے لیے طلبہ نئی دہلی، کولکتہ، بنگلور، ممبئی، پٹنہ، دربھنگہ، سری نگر، رانچی، امراوتی، حیدرآباد، جموں، نوح، وارانسی اور لکھنؤ میں واقع یونیورسٹی کے ریجنل/سب ریجنل سنٹرس سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں یا ویب سائٹ **manuu.edu.in/dde** ملاحظہ کریں۔

آن لائن درخواست فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ بی۔ایڈ کے لیے **25 جولائی 2023** اور دیگر تمام پروگراموں کے لئے **25 اگست 2023** ہے۔ سبھی پروگراموں کے لیے فیس ادائیگی کی آخری تاریخ **31 اگست 2023** رات 11:59 بجے سے قبل مقرر ہے۔

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم　　**manuu.edu.in/dde**　　رجسٹرار

Printed,Published & Prop. By **Ahmad Rashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow　　**Editor: Dr. Saleem Ahmad**

جون تا نومبر ۲۰۲۳ء
ISSN: 2581-5482
جلد : ۶ شمارہ : ۳،۴

سہ ماہی

ادبی نشیمن

سرپرست

ڈاکٹر عامر قدوائی (کویت)

ڈاکٹر وسیم احمد صدیقی (آسٹریلیا)

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد

Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com
adbeenasheman@gmail.com

معاون ایڈیٹر

شاہد حبیب

Mob: 8539054888
shahidhabib10@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین) — ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر مجاہد الاسلام (لکھنؤ) — ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو) — وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)
محمد حنظلہ ندوی (لکھنؤ)

☆ ادبی نشیمن کو RNI سے رجسٹریشن سرٹیفکیٹ Adbee Nasheman کی اسپیلنگ کے ساتھ ملا ہے۔ اس لیے غلط ہونے کے باوجود مجبوراً یہی اسپیلنگ ہر جگہ استعمال کی جا رہی ہے۔

☆ ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے خیالات قلمکاروں کے اپنے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

☆ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی کا اختیار صرف لکھنؤ کی عدالتوں کو حاصل ہے۔

ADBEE NASHEMAN

قیمت

اس خصوصی شمارے کی قیمت:	۴۰۰ روپے
دو سالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک:	۳۰۰ روپے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک):	$25 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ:	پانچ ہزار روپے
لائبریری / اداروں کے لئے:	۶۵ روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ

سہ ماہی ادبی نشیمن

168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168, Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

www.adbeenasheman.com
E-mail: adbeenasheman@gmail.com

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارود خانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست سہ ماہی ادبی نشیمن، لکھنؤ (رباعی نمبر) جون تا نومبر ۲۰۲۳

آغاز

۱	حمدیہ رباعیاں	ڈاکٹر اختر ریاض	۵
۲	نعتیہ رباعیاں	محمد عارف حسن خاں	۶

اداریہ

۳	نظریہ	ڈاکٹر سلیم احمد	۷
۴	پیغام	پروفیسر خواجہ اکرام الدین	۸
۵	پیغام	پروفیسر شمس الہدیٰ	۹
۶	پیغام	ڈاکٹر اطہر فاروقی	۱۰

حصہ اول (رباعی: فن و تاریخ)

۷	رباعی اور اس کے اوزان	ڈاکٹر اختر ریاض	۱۲
۸	رباعی: فن اور امکانات	حافظ کرناٹکی	۱۷
۹	رباعی: آہنگ، ارکان اور ہیئت و قوافی کے تجربے	اسلم حنیف	۳۰
۱۰	صنف رباعی اور اس کا فن	انس مسرور انصاری	۳۹
۱۱	مزید امکانات رباعی کے وزن میں	محمد انور ضیاء	۴۲
۱۲	رباعی فن اور روایت	راشدہ خاتون	۴۵
۱۳	رباعی کا فن اور اس کا ارتقاء	سفیان احمد انصاری	۴۸
۱۴	رباعی مشکل ترین فن	احتشام افسر	۵۳

حصہ دوم (رباعی: تنقید و تحقیق)

۱۵	رباعی پس منظر سے پیش منظر تک	پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال	۵۶
۱۶	کرناٹک میں رباعی: ماضی تا حال	پروفیسر مقبول احمد مقبول	۶۳
۱۷	رواں: منفرد رباعی گو	پروفیسر صغیر افراہیم	۷۲
۱۸	نقد رباعیات جمیل مظہری	پروفیسر عراق رضا زیدی	۷۷
۱۹	ظفر کمالی کی رباعیاں	صفدر امام قادری	۸۱
۲۰	شاہین رضا زیدی کی رباعیاں	پروفیسر احمد محفوظ	۹۱
۲۱	رباعیات خیام کا اجمالی جائزہ	محمد ظفر جلالپوری	۹۵
۲۲	خواجہ الطاف حسین حالی کی رباعی گوئی	ڈاکٹر رضوان انصاری	۹۹
۲۳	عبدالغفور خاں ناسخ: بہ حیثیت رباعی گو	ڈاکٹر تسلیم عارف	۱۰۲

۲۴	علامہ اقبال: بحیثیت فارسی رباعی گو شاعر	ڈاکٹر زین العباء/ڈاکٹر عابد ابراہیم	۱۰۷
۲۵	زیب النساء زیبی کی رباعیات کا انتقادی مطالعہ	محسن اعظم محسن ملیح آبادی	۱۱۰
۲۶	'نیرنگ رباعی': ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مجاہد الاسلام	۱۱۳
۲۷	نشتر یاس یگانہ چنگیزی	ڈاکٹر امیر حمزہ	۱۱۷
۲۸	طرف قریشی کی رباعیات	ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین ربانی	۱۲۲
۲۹	ظہیر غازی پوری کی رباعی گوئی	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۱۲۶
۳۰	ناوک حمزہ پوری کی رباعیات	ڈاکٹر عرفانہ بیگم	۱۲۹
۳۱	رباعیات سید عابد علی وجدی الحسینی: ایک مطالعہ	ڈاکٹر اعظم	۱۳۲
۳۲	دکن میں رباعی کی شمع۔ شاہ حسین نہری	ڈاکٹر ابو اسامہ (ابن آدم)	۱۳۴
۳۳	رباعیات روشن: ایک اجمالی جائزہ	ڈاکٹر غلام حسین	۱۳۶
۳۴	رباعیات فراق: ایک مطالعہ	ڈاکٹر معراج الدین خاں	۱۳۹
۳۵	اجتبیٰ رضوی: مفکر رباعی گو	پروفیسر رئیس انور	۱۴۳
۳۶	محبوب رباعیات: ایک تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر یاسر عباس	۱۴۶
۳۷	رباب رشیدی کی رباعی گوئی	محمد عشرت صغیر	۱۴۹
۳۸	ترقی پسند رباعی گو: پرویز شاہدی	محمد منظر حسین	۱۵۵
۳۹	رباعیاتی نظم: مامون ایمن کا ایک منفرد تجربہ	نذرانہ بی بی	۱۵۹
۴۰	صادق تین: نام ایک، کام انیک	ڈاکٹر سنجے مصرا شوق	۱۶۴
۴۱	فصیح ابن فیضی کی رباعی گوئی	ڈاکٹر صوفیہ محمود	۱۶۶
۴۲	رباعیات شوق نیموی: ایک جائزہ	طفیل احمد مصباحی	۱۶۹
۴۳	کوثر صدیقی کی رباعیات پر ایک نظر	ڈاکٹر یاسمین اختر (بھاگلپور)	۱۷۳
۴۴	اشراق حمزہ پوری کی رباعی گوئی	تنویر اختر رومانی	۱۷۷
۴۵	رباعیات فرید کی فکری و معنوی جہت	ارشاد آفاقی	۱۷۹
۴۶	رباعی کے گلابوں کے روشن چراغ: ظہور منصوری نگاہ	رئیس الدین رئیس	۱۸۴
۴۷	نور محمد یاس: بہ حیثیت رباعی گو	سیفی سرونجی	۱۸۶
۴۸	عاصم شہنواز شبلی اور باغ صنوبر	انجم عظیم آبادی	۱۸۸
۴۹	عابدہ شیخ: گلشن رباعی کا نیا پھول	شاہینہ پروین	۱۹۰
۵۰	رباعیات انیس: ایک مطالعہ	عذرا انجم	۱۹۳
۵۱	کلیات رباعیات جوش: جوش شناسی کا نیا باب	حقانی القاسمی	۱۹۸

۵۲	دبستانِ لکھنؤ میں صنفِ رباعی کا آغاز وارتقاء: ایک اجمالی تعارف	مجتبیٰ حسن صدیقی	۲۰۱
۵۳	اردو کے غیر مسلم رباعی گو شعراء	خوشبو پروین	۲۱۳
۵۴	میرٹھ کے اہم رباعی گو شعراء: ایک جائزہ	ڈاکٹر ارشاد سیانوی	۲۱۹
۵۵	صنفِ رباعی میں فلسفۂ لاادریت کا مختصر جائزہ	ڈاکٹر عبدالحق امام	۲۲۸

تخلیق رباعیات

۵۶	رباعیات	مخمور کاکوروی	۳۸
۵۷	رباعیات	شاہ حسین نہری	۴۲
۵۸	رباعیات	پروفیسر عراق رضا زیدی	۵۲
۵۹	رباعیات	پروفیسر ڈاکٹر محمد اشرف کمال	۶۲
۶۰	رباعیات	طہور منصوری نگاہ	۹۰
۶۱	رباعیات	ذکی طارق (غازی آباد)	۹۴
۶۲	رباعیات	اسلم حنیف	۱۰۱
۶۳	رباعیات	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	۱۰۶
۶۴	رباعیات	سلیم سرفراز	۱۰۹
۶۵	رباعیات	محمد انور ضیاء	۱۲۵
۶۶	رباعیات	ڈاکٹر فرحت نادر رضوی	۱۲۸
۶۷	رباعیات	اعجاز مانپوری	۱۳۱
۶۸	رباعیات	فیضی سمبلپوری	۱۳۲
۶۹	رباعیات	فہیم بسمل،	۱۵۸
۷۰	رباعیات	ساجد عارفی خیرآبادی	۱۶۳
۷۱	رباعیات	ڈاکٹر ہارون رشید، لکھنؤ	۲۱۸
۷۲	رباعیات	معید رہبر	۲۲۷
۷۳	رباعیات	زیب النساء زیبی/مصباح انصاری	۲۳۱
۷۴	رباعیات	محسن عظیم انصاری، لکھنؤ	۲۴۷

حصہ سوم (رباعی: تبصرے)

۷۵	رباعیاتِ قمر — از: قمر سیوانی	مبصر: صفدر امام قادری	۲۳۳
۷۶	آئینِ رباعیات — از: پروفیسر عراق رضا زیدی	مبصر: پروفیسر علیم اشرف خان	۲۳۵
۷۷	انسان (ایک موضوع پر مبنی منثور اور رباعیات میں نظم) از: ساموں ایمن	مبصر: سوی پروین	۲۳۶
۷۸	سوغات — از: ظفر کمالی	مبصر: شاہد حبیب	۲۳۹
۷۹	رباعی تحقیق — از: ڈاکٹر امیر حمزہ	مبصر: شاہد حبیب	۲۴۰
۸۰	اشاریہ مجموعۂ رباعیات (اردو)	تحقیق وترتیب: تنویر اختر رومانی	۲۴۲
۸۱	مراسلہ	قارئین (ابوالفیض اعظمی)	۲۴۷

ترقی پسند رباعی گو: پرویز شاہدی

محمد مظفر حسین

(اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا۔ موبائل: 9883874711)

مغربی بنگال کو بہت ساری چیزوں میں اولیت حاصل ہے۔ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں صحافت کی ابتدا اسی سرزمین سے ہوئی ہے۔ یہ اردو نثر کی ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی ہے۔ نواب واجد علی شاہ نے مٹیا برج کو لکھنؤ ثانی بنایا۔ برصغیر ایشیا میں سب سے پہلے ادب کا نوبل انعام رابندر ناتھ ٹیگور کو ان کی تخلیق "گیتانجلی" پر دیا گیا۔ جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو یہاں کے شاعر و ادیب نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان لوگوں میں اردو شاعر و ادیب بھی شامل تھے۔ یہاں اردو کے کئی بڑے شاعر و ادیب ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے۔ انھیں میں ایک اہم نام پرویز شاہدی (۱۹۱۰-۱۹۶۸) کا بھی ہے، جنھوں نے مغربی بنگال میں ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پرویز شاہدی ایک ادبی شخصیت کا نام ہے جو اردو نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ لیکن اردو ادب میں انھیں صنف شاعری میں جو شہرت ملی اس سے ایک زمانہ واقف ہے۔ انھوں نے روایت کے مطابق اپنی ادبی زندگی کا آغاز صرف آٹھ برس کی عمر میں غزل سے کیا لیکن زمانے اور حالات کو دیکھتے ہوئے نظم گوئی کی جانب بھی توجہ دینا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظم نگاری کی دنیا میں اپنی ایک الگ شناخت بنالی۔ انھوں نے اردو شاعری کو کئی شاہکار نظمیں جیسے بے چارگی، شہروائی، وحشت، اجالا، سماج، مستقبل، انتظار، شکست، تثلیث حیات، رقص حیات وغیرہ دیے۔ اردو شاعری کی ایک اہم صنف جس کی جانب پرویز نے خاص توجہ دی وہ رباعی کا فن ہے۔ ان کے کل دو مجموعہ کلام 'رقص حیات' اور 'تثلیث حیات' ہیں۔ ان میں صرف 'رقص حیات' میں ہی رباعیات شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں رباعیوں کی کل تعداد ۱۰۳ ہے۔ ۲۰۱۰ء میں 'رباعیات پرویز شاہدی' کے عنوان سے ان کی تمام رباعیوں کو یکجا کر کے کتابی شکل دی گئی۔ اس کتاب میں کل ۱۹۳ رباعیات شامل ہیں جبکہ ان کے دوسرے مجموعہ کلام میں کوئی رباعی شامل نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ ہم پرویز شاہدی کی رباعی گوئی کا جائزہ لیں، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صنف رباعی پر گفتگو کی جائے۔

اردو شاعری میں صنف رباعی کو ایک خاص اہمیت و مرتبہ حاصل ہے۔ اس کے آغاز کے تعلق سے مختلف رائیں پائی جاتی ہیں لیکن اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ رباعی کا موجد اول ابوالحسن رودکی ہے۔ رباعی ایک ایسی صنف شاعری ہے جس میں غزل اور نظم دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ رباعی عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ ربع سے مشتق ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ چوں کہ یہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں اس لیے رباعی کہلاتی ہیں۔ اصطلاحاً رباعی ایسی مختصر نظم کو کہتے ہیں جو کل چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہیں جس کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور اس کے لیے مخصوص اوزان مقرر ہیں۔

بنگال میں پرویز شاہدی کی حیثیت ترقی پسند کے روح رواں کی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندی ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ مغربی بنگال میں پرویز شاہدی کو ترقی پسند تحریک کا امام کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے لائق اظہار بنایا۔ پرویز شاہدی کے شعری سرمایے میں رباعی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جب انھیں اپنے فن میں پختگی حاصل ہوگئی تو انھوں نے اکثر مشاعروں میں اپنے کلام کی شروعات صرف رباعی سے کی بلکہ اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔

پرویز شاہدی کی رباعیوں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدا میں اپنے بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے رباعیوں کی شروعات روایتی موضوعات، جیسے تصوف، حکمت، شراب، عشق وغیرہ سے کی۔ بعد میں حالات کے مطابق موضوعات میں بھی تبدیلیاں ہوتی گئیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کی رباعیوں میں ہر طرح کے موضوعات پائے جانے لگے۔ مثال کے طور پر درج ذیل رباعیات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے:

آباد ہے جلوۂ شراب آنکھوں میں
ضو بار ہے صبح کا شباب آنکھوں میں
ہیں بادۂ شب گیر کی بوندیں آفت
رقصاں ہیں ہزاروں آفتاب آنکھوں میں

لا جلد شرابِ سرخ و روشن ساقی
بھراں ہے وہ گھڑی کا ساون ساقی
ئے خانے میں کون عرش سے بھاگے گا
بادل کی پڑی ہوئی ہے چلمن ساقی

پرویز شاہدی کے فن میں جب پختگی آ گئی تو وقت اور حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنے موضوعات میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ نت نئے موضوعات کو اپنی رباعیوں میں جگہ دینے لگے۔ ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی نے ان کی رباعیوں میں ترقی پسندانہ موضوعات کو جگہ دیا جس کی مثالیں ان کی رباعیوں میں جابجا نظر آتی ہیں:

ہے بے دلوں میں ہمت جاگی
غیرت نے جھنجھوڑا تو مشقت جاگی
گھڑی کی نیند کا شیشہ ٹوٹا
وہ دیکھو بھی ہو ، وہ بغاوت جاگی

■

طوفاں میں کسی کا آسرا بے معنی
ہر چیز یہاں اپنے سوا بے معنی
آغوشِ تلاطم میں ہے کشتی رقصاں
ایسے میں خیال نا خدا بے معنی

مذکورہ رباعیات کے مطالعہ سے پرویز شاہدی کا باغیانہ تیور صاف طور پر عیاں ہوتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند نظریہ کو ملحوظ نظر رکھ کر یہ رباعیاں کہی ہیں۔ وہ غریب، مزدور اور ناتواں لوگوں کو مخاطب کر کے للکارتے ہیں کہ کسی مصیبت کا سامنا تمہیں خود کرنا ہے۔ کسی ناخدا کا انتظار کرنا لاحاصل ہے کیوں کہ طوفاں میں پھنسی ہوئی کشتی کو ساحل سمندر تک لے جانا خود تمہاری اپنی ذمہ داری ہے اور تم بھی کامیاب و کامران ہو سکتے ہو جب تم دوسروں پر بھروسہ کرنے کی بجائے خود کے بازوؤں پر بھروسہ کرنے لگو گے۔ جس دن تمہیں اپنے بازوؤں کی قوت کا علم ہو جائے گا، اسی دن تمہارے دل سے خوف ختم ہو جائے گا اور تمہارے اندر ہمت پیدا ہو جائے گی اور تم ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرو گے اور یہی تمہاری کامیابی و کامرانی ہوگی۔ ترقی پسند تحریک کی حمایت میں کہی گئی ان کی درج ذیل رباعیوں کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

صحراؤں کی بات ذرّوں میں کی
روداد حیات استعاروں میں کی
حیرت ہے زمانے کو آخر کیوں کر
پرویز نے داستان اشاروں میں کی

■

بارش میں کب آگ سر اٹھا سکتی ہے
کب موت حیات کو دبا سکتی ہے
اے امن کے گیتوں کی گھٹاؤ! برسو
بارود کا کیا ہے بھیگ جا سکتی ہے

پرویز شاہدی نے اپنے رباعی میں سیاسی موضوعات کو بہت ہی سلیقے سے پیش کیا ہے۔ وہ ملک کے ٹھیکیداروں کو اپنی رباعیوں میں للکارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا کہ آج سارا عالم نئے نظام کی تلاش میں ہے اور تم وہی پرانی اور بیکار روایتوں کو لیے پھر رہے ہو۔ پرانی اور فرسودہ روایتوں کو چھوڑ کے آگے بڑھنے کی کوشش کرو کیوں کہ آج تمام چیزوں میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اس لیے اگر تم ترقی کے خواہش مند ہو تو نئی چیزوں کی تلاش و جستجو کرو ورنہ روایتوں کے ساتھ تم زمانے سے بچھڑ جاؤ گے:

بے سود قدامتیں لیے بیٹھے ہو
فرسودہ شریعتیں لیے بیٹھے ہو
ہے آج نئے نظام عالم کی تلاش
تم کل کی روایتیں لیے بیٹھے ہو

طنز و مزاح کا عنصر تمام شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کے ذریعہ تخلیق کار بڑی سے بڑی باتیں مزاح کی روشنی میں بہ آسانی کہہ دیتا ہے اور یہ خصوصیات پرویز شاہدی کی رباعیوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی رباعیوں میں طنز و ظرافت کی چاشنی پیدا کر کے اسے خصوصیت کا حامل بنا دیا ہے۔ اس تعلق سے درج ذیل رباعیوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

محروم نہ کمزوری کے مارے رہ جائیگا
ہنگام شباب بے سہارے رہ جائیگا
امریکہ کے ساتھ بن گئے گھر داماد
بھارت کے نہ سب نقل کنوارے رہ جائیگا

صنعت اوّل ہے اور صناعت آخر
دولت اوّل ہے اور دولت آخر
بولے وہ چھٹائی کر کے مزدوروں کی
محنت اوّل ہے اور محنت آخر

پرویز شاہدی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے ضرور تھا لیکن انہوں نے کبھی بھی اپنے فن کو کسی نظریے کا غلام بننے نہیں دیا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی تخلیقات میں فنی خوبیوں کو اولیت دیا اور نظریہ کو ثانوی درجہ۔ ان کی ہمیشہ یہی سوچ رہی کہ کسی نظریے کا پابند ہونا الگ چیز ہے اور شعر و ادب الگ چیز۔ انہوں نے اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ ان کی تخلیق پہلے تخلیق رہے، پھر بعد میں کسی نظریے کا پابند اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیق سے تخلیقیت کہیں بھی معدوم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی ہے اور ان کی اسی کوشش نے فن کو ہمیشہ پروپگنڈہ بننے سے بچائے رکھا۔ انہوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح شعر و ادب کو زندگی کی بہتری اور تعمیر نو کا بہترین ترجمان بنا دیا۔ جس سماج میں عوام کا سامراجی نظام، جاگیردارانہ نظام اور سماج کی گروہ بندی سے استحصال ہو رہا تھا، اس سماج کے خلاف پرویز شاہدی عملی اور تخلیقی سطح پر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ کریں:

بلبل کی زباں تک جلا ڈالی ہے
مسموم ہوائے گل بنا ڈالی ہے
ان آگ کے تاجروں نے
گلشن میں بھی بارود بچھا ڈالی ہے

زنجیر کا لوہا بھی پگھل جائے گا
شمشیر ہی کے سانچے میں ڈھل جائے گا
شعلے دل باغی کے بڑے سرکش ہیں
جو سامنے آئے گا وہ جل جائے گا

پرویز شاہدی اپنی رباعیوں میں ہمیشہ آسان، سلیس اور عام فہم اسلوب کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی رباعیوں میں ضرورت کے مطابق انگریزی اور ہندی کے الفاظ کا استعمال اس ہنر مندی کے ساتھ کرتے ہیں کہ قاری کو احساس تک نہیں ہوتا۔ فارسی ترکیبوں کے استعمال بھی ان کے یہاں جا بجا ملتے ہیں۔ وہ تشبیہات، استعارات، محاورات، اصطلاحات وغیرہ کا استعمال اس فنکاری سے کرتے ہیں کہ قاری کو گراں بھی نہیں گزرتا اور معنی کی ترسیل بھی ہو جاتی ہے:

میں منکر اسلاف نہیں ہوں یارو!
کچھ حاسد اوصاف نہیں ہوں یارو!
ہر شعر میں بھرتا ہوں مگر وقت کی آگ
شاعر ہوں، ہاف نہیں ہوں یارو!

لذت میں خودی کی کھو گیا ہے
دور دور خدا سے ہو گیا ہے زاہد
سنتا نہیں اب قلقلۂ مسجد کی صدا
سجدے میں کچھ ایسا سو گیا ہے زاہد

رباعی کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ کہ تخلیق کار اس میں فکر و فلسفہ کو پیش کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رباعی کے چاروں مصرعے فکر و فلسفہ کو پیش کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ قاری رباعی کی شعری اظہار کے ٹیکنک میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اس کے اندر پیش کیے گئے فکر و فلسفہ کو بہ آسانی قبول کر لیتا ہے۔ اس ہنر سے پرویز خوب اچھی طرح سے واقف تھے۔ وہ بعض دفعہ اپنے ترقی پسندانہ خیالات کو فلسفہ اور اصطلاحات کے ذریعہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ فلسفہ و فکر بھی فن کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی ان خصوصیات کو پرویز کی درج ذیل رباعیوں کے ذریعہ بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے:

کچھ نکتۂ راز کیف و کم مجھ سے سن
کچھ فلسفۂ نشاط و غم مجھ سے سن
مجبور سکوت میں رہا ہوں برسوں
دولت کی حکایت ستم مجھ سے سن

باہر نہ کبھی آگ کو جانے دوں گا
شعلے کو کبھی سر نہ اٹھانے دوں گا
پھنک جائے تو پھنک جائے مرا دل لیکن
دامن پہ ترے آنچ نہ آنے دوں گا

پرویز شاہدی کی رباعیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ ایک ایسے رباعی گو ہیں، جن کی رباعیوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو رباعی میں ہونی چاہئے۔ انہوں نے ہر قسم کی رباعیاں کہیں اور اس میں مختلف موضوعات کو بھی اپنایا۔ رباعی کے موضوعات کو وسعت دینے میں پرویز شاہدی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی رباعیوں کے ذریعے کلاسیکی اور جدید روایت کے درمیان ایک نیا آہنگ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علیم اللہ حالی کے خیالات سے اتفاق کرنا ہمارے لیے اس لیے ناگزیر ہے کہ انہوں نے پرویز شاہدی کی رباعی کے سلسلے میں جس طرح کی رائے قائم کی ہے، اس سے ہمیں پرویز شاہدی کی رباعی کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

''صنف رباعی کی تاثیر تو اس کے چوتھے مصرعے سے ظاہر یا مکمل ہوتی ہے لیکن اس صنف کا لطف اظہار یہ ہونا چاہئے کہ اس کا ہر مصرعہ زینہ بہ زینہ اس کی تکمیل کی طرف لے جائے، یعنی یہ کہ کوئی مصرعہ صرف قافیہ پیمائی کے لیے نہ ہو بلکہ اس سے خیال میں تسلسل پیدا ہوجائے۔ پرویز شاہدی کی رباعیوں میں یہ خوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی رباعیاں صرف کیف وسرور پیدا نہیں کرتیں بلکہ شاعر کے پسندیدہ موضوع کو مضبوط اور دلکش انداز میں پیش کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہیں۔ انہوں نے رندی وسرمستی کے سلسلے میں روایتی طور پر بیان ہونے والے الفاظ واشارات سے ایک نیا کام لینے کی کامیاب کوشش کی ہے اور یوں پرویز شاہدی کی رباعیوں سے خود اس کی صنف کے موضوعی امکانات میں زبردست وسعت پیدا ہوگئی ہے۔''

(پرویز شاہدی، علیم اللہ حالی، ص: ۵۴)

☆☆☆

رباعیات

فہیم بسمل، شاہ جہاں پور
8707771203

سورج سے کہو حجرے کے باہر نکلے
لپٹا ہے جو کہرے میں وہ منظر نکلے
شب بھر تو رہا چاروں طرف سناٹا
دن نکلے تو راہی چلیں رہبر نکلے

■

ہم عزم کے سانچے میں جو ڈھل جائیں گے
محرومی کی بانہوں سے نکل جائیں گے
گلرنگ اُمیدوں کا چمن مہکے گا
اک روز یہ حالات بدل جائیں گے

■

دیکھا نہ کسی کا کبھی ایسا لہجہ
اس پیکرِ خوبی کا ہے جیسا لہجہ
واقف ہے وہ تہذیب محبت سے خوب
کڑوا نہیں ہوتا کبھی اس کا لہجہ

■

جن کے سبھی منظر تھے سہانے والے
کچھ ایسے تھے دن رات پرانے والے
بہتر ہے یہی، کوئی نہ پوچھے مجھ سے
دن کیسے ہیں موجودہ زمانے والے

■

اُمید کی شمعوں کو جلانے آؤ
تم رسمِ وفا یوں بھی نبھانے آؤ
دیرینہ محبت کا تقاضا ہے یہی
روٹھا ہوں اگر میں تو منانے آؤ

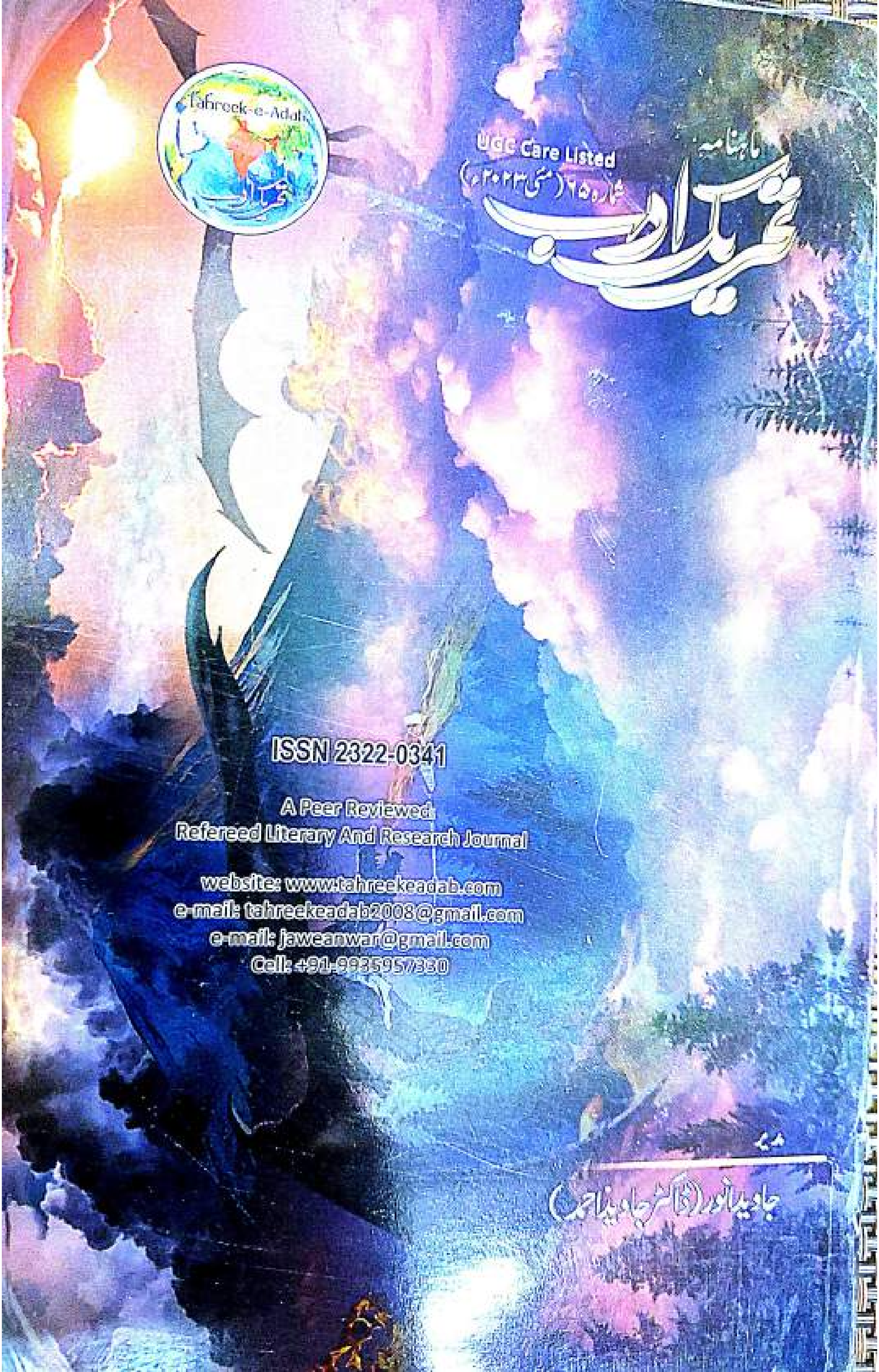
Tahreek-e-Adab
ماہنامہ
UGC Care Listed
تحریک ادب
شمارہ ۶۵ (مئی ۲۰۲۳ء)
ISSN 2322-0341
A Peer Reviewed:
Refereed Literary And Research Journal
website: www.tahreekeadab.com
e-mail: tahreekeadab2008@gmail.com
e-mail: jaweanwar@gmail.com
Cell: +91-9935957330
جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد)

فہرست

1۔خواہش ناتمام (نعتیہ نظم) پیر حسن انظر 6
مضامین
1۔انیس انصاری کی شعری انفرادیت پروفیسر شارب ردولوی 7
2۔اردو میں واسوخت نگاری (آخری قسط) پروفیسر شاہینہ رضوی 18
3۔ظفر اوگانوی: بحیثیت شاعر ڈاکٹر دبیر احمد 22
4۔بچوں کی نشوونما میں اشتعال انگیز اور پر تشدد گیمز اور فلموں کا اثر ڈاکٹر فرحت علی 33
نظمیں: اسلم عمادی، چندر بھان خیالؔ، ڈاکٹر شبنم عشائی 38
مضامین
1۔اضطراب۔۔بے چینی کی علامت، وجوہات اور علاج ڈاکٹر طیبہ نازلی 41
2۔میراجی کی تنقید نگاری محمد شاہد پٹھان 47
3۔منیر نیازی کی شاعری کا علامتی نظام ڈاکٹر محمد شاہد 59
4۔انور سجاد اور علامت نگاری ڈاکٹر مہ جبیں 66
5۔دورِ جدید کا معتبر افسانہ نگار: عبدالصمد داؤد احمد 71
6۔اردو میں سائنسی مزاج پیدا کرنے میں فارسی زبان کا کردار ڈاکٹر بلال احمد شیخ 77
7۔پہاڑی افسانے نافن تے روایت ڈاکٹر مشتاق صدیقی 84
غزلیں: پون کمار، پروفیسر عبدالمالک، مظہر افتخاری، افتخار راغب، حمید اللہ ماہرؔ، امتیاز نسیم ہاشمی، ذوالفقار نقوی، آمنہ غزل 91
مضامین:
1۔ناسٹالجیا اور جدید کشمیری شاعری ڈاکٹر ظہور احمد 98
2۔کشمیری ترقی پسند شاعری میں رومانی رجحانات۔۔۔ڈاکٹر جاوید احمد نجار 104
3۔پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی تنقیدی بصیرت۔۔۔ نوید احمد خان 110

Zafar Oganvi : Bahaisiyat Shair by Dr. Dabir Ahmad(HOD Urdu,Maulana Azad College Kolkata)cell-9433078802

ڈاکٹر دبیر احمد (ایسوسیٹ پروفیسر اور صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا)

ظفر اوگانوی : بہ حیثیت شاعر

جدید اردو ادب کو بجا طور پر یہ افتخار حاصل ہے کہ جدیدیت کی تحریک نے بہت سارے ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔ اس تحریک نے جہاں نثر میں اچھا خاصا ذخیرہ جمع کیا، وہیں شاعری کی دنیا میں بھی اچھے شاعر پیدا کیے اور آج نثری نظم کی صورت میں جو کچھ تخلیقات ہیں، سب اسی تحریک کی مرہون منت ہیں۔ جدید اردو نظم کا آغاز ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ دور دراصل عبوری دور میں سامنے آنے والے شاعروں اور ادیبوں کے ذریعہ اپنے قبل کی شاعری سے انحراف کا زمانہ ہے۔ چونکہ تقسیم وطن کے بعد کے معاشرتی حالات نے جس طرح رُخ اختیار کیا، اس سے برصغیر کا ہر دانشور طبقہ متاثر ہوا اور فکری طور پر نئی نسل نے ان حالات کو شدت سے محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی نئی نسل کے احساسات کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ:

"یہ نسل ان نوجوانوں کی تھی، جنھوں نے آزادی اور تقسیم کی فضا میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ دور برصغیر ہند و پاک میں تہذیبی و سیاسی، اخلاقی اور سماجی اقدار کی شکست اور پامالی کا دور ہے۔ نظریہ، عقیدہ، نصب العین، آدرش، خوش آئند مستقبل کا خواب، جماعتی وابستگی اور اجتماعی تحریکوں پر یقین کا طلسم ایک ایک کرکے بکھرنے لگا۔ مینی فیسٹو، اعلان نامے، طے شدہ راستوں پر چلنے اور چل کر اپنی منزل مراد تک پہنچنے کے دعوے بے معنی اور بے سود نظر آنے لگے۔ نیکی اور بدی، جھوٹ اور سچائی، محبت اور نفرت، خلوص اور عدم۔ خلوص کے بنے بنائے پیمانے بے کار نظر آنے لگے۔"

اردو میں آزاد نظم کی جو شکل و صورت موجود ہے، اس میں اوزان و بحور کی پابندی سمجھی جاتی رہی ہے۔ بعض شعرا کے یہاں ایسی نظمیں بھی پائی جاتی ہیں، جن میں ایک سے زیادہ بحریں استعمال ہوئی ہیں لیکن ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت سے متاثر ہونے والے شعرا نے ایسی آزاد نظمیں لکھی ہیں، جن میں موزوں اور ناموزوں، دونوں طرح کے مصرعے پائے جاتے ہیں۔ چونکہ مغرب میں آزاد نظم، اوزان و بحور سے آزاد سمجھی جاتی رہی ہے، لہٰذا جدید تر شاعروں نے مغرب کے تصور کو مکمل

طور پر قبول کرتے ہوئے مغرب کی آزاد اور نثری نظم کے تصور سے خود کو قریب کرتے ہوئے نظمیں لکھیں، اس لئے اوزان و بحور سے مکمل آزادی نے اردو میں نثری نظم کو فروغ دیا۔ یہ سچ ہے کہ نثری نظم کو ۱۹۶۰ء کے بعد مقبولیت نصیب ہوئی لیکن یہ مقبولیت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ اس دور کے شاعروں نے آزاد اور نثری نظموں کے لئے کوئی خاص تحریک چلائی ہوں بلکہ دوسری ہیئتوں کے ساتھ ساتھ نثری نظمیں لکھی گئی ہیں۔ نثری نظم کے بارے میں ڈاکٹر شہریار لکھتے ہیں:

''جتنی آسودگی مجھے نثری نظم لکھ کر ہوتی ہے، وہ شاید دوسری جو میری اچھی شاعری سمجھی جاتی ہے، اس میں شاید مجھے اتنی آسودگی نہیں ہوتی۔''

چونکہ انکشاف ذات چھٹی اور ساتویں دہائی کے شاعروں کی شناخت ہے۔ ان شاعروں پر ان کے مخصوص رویّے کے سبب 'داخلیت پسند' یا 'انفرادیت پرست' ہونے کا الزام ہے جو بے بنیاد ہے کیونکہ جدید شاعروں نے خارجی کائنات سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا ہے بلکہ سماج سے رشتہ برقرار رکھا ہے۔ جہاں تک جدید شاعروں میں ظفر اوگانوی کی شناخت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں ان کی شخصیت قدآور نہیں بن سکی کیونکہ ابتدأ میں انہوں نے شاعری تو ضرور کی لیکن اسے ذریعۂ اظہار نہیں بنایا بلکہ افسانے کو اظہار کا وسیلہ بنا کر ادب میں اپنی شناخت قائم کی۔ اس ضمن میں موصوف کا خیال ہے کہ:

''مجھے افسانہ نگار بنانے میں میری ناکامیوں کا دخل ہے لیکن افسانہ نگاری کے انتخاب کی مقبول وجہ اس وقت سمجھ میں آئی، جب میں نے کچھ نظمیں اور دو ایک غزلیں کہیں۔ میں نے اپنی چیزیں مشاعروں میں سنائی ہیں اور رسالے میں شائع بھی ہوئی ہیں مگر جب بھی میں نے اپنی توجہ شاعری کی طرف ڈالنی چاہی تو مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ شاعری زندگی کی ہمہ گیر وحدانیت کو شدید، بھرپور اور مکمل طور پر پیش نہیں کرسکتی ہے۔ آپ مجھ سے اختلاف کرسکتے ہیں، ان میں مجھے جذبہ تو ملتا ہے مگر جذبے کی آنچ میں تپا ہوا وہ شعور نہیں آتا جو افسانہ کے اندر پایا جاتا ہے۔''

مذکورہ اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ظفر اوگانوی شروع ہی سے اشعار کہا کرتے تھے لیکن شعر گوئی کو مستقل فن نہیں بنایا۔ میرے خیال میں کچھ طبیعت کی بے نیازی اور کچھ صحافتی مشغولیت نے ان کی شاعری کو پس پردہ ڈال دیا، ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک مکمل شاعرانہ شخصیت کے مالک ہوتے، اگر شاعری کو ذریعۂ اظہار بنایا ہوتا، تاہم انہوں نے جو نظمیں اور غزلیں کہی ہیں، وہ سپاٹ نہیں بلکہ معیاری اور منفرد ہے۔ انہوں نے غزلیں بہت کم کہی ہیں مگر یہاں بھی انہوں نے اپنی بے پناہ فکری بصیرت اور فنی رچاؤ کا ثبوت دیا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ ظفر اوگانوی

نے مشاعروں میں بھی شرکت کی اور وہاں اپنی چیزیں پڑھی بھی ہیں، جن کے متعلق انہوں نے خود رسالہ 'جائزہ' (پاکستان) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا۔ اسی طرح ایک فرمائشی نظم جو 'بزم آزادی' کی ایک تقریب میں شرکت کے لئے لکھی گئی لیکن موصوف اس تقریب میں شرکت کرنے سے قاصر رہے۔ اپنی اس طویل نظم کو انہوں نے 'صدائے عام' (پٹنہ) میں ۱۵ راگست ۱۹۵۷ء کو شائع کرایا۔ اس طویل نظم میں شاعر نے مفلسی اور اخلاص کا رونا رویا ہے اور اسی لاچاری، مفلسی اور ناداری کی وجہ سے شرکت کرنے سے معذوری ظاہر کردی۔ یہاں صرف دو بند حوالے کے طور پر پیش کیے جارہے ہیں، جن سے شاعر کی افتادِ طبع کا پتا چلتا ہے۔ بند کچھ اس طرح ہے:

کس نے سوچا ہے شکم ان کے ہیں خالی کب سے　　ان چراغوں سے بھی افلاک ہیں اب تک روشن
جن کے چولہے سے مہینوں میں دھواں اُٹھتا ہے　　جو کہ لاچار ہے، مفلس بھی ہے، نادار بھی ہے
ان چراغوں سے مجھے بوئے دیا آتی ہے　　جن کی پلکوں پہ ہیں افلاس کے تارے روشن
ایک طرف وقفِ تصنع کے لئے دولت ہے　　ایک طرف بھوک ہے، افلاس ہے، ناداری ہے
میرے محبوب! یہاں غم کی چھٹا چھائی ہے

ظفر اوگانوی نے دورِ جدید کی کشمکش، اقدار کی پامالی وغیرہ کو اپنی شاعری میں بڑی فنکاری اور ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا۔ لفظیات اور موضوعات ہر دو اعتبار سے ظفر اوگانوی کی شاعری، جدیدیت کی بساط پر گہرے نقوش چھوڑتی ہیں۔ انہوں نے نئے پیرائے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی خوش اسلوبی سے کیا ہے جس سے ظاہر ہے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ دورِ حاضر کے معاملات و مسائل کو بھی نئے پیرائے میں پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ چند اشعار بطور استدلال پیش ہیں:

ہمیں نے رکھا تھا جس کبوتر کو پر کتر کے
وہیں اڑانوں پہ آج بے بال و پر گیا ہے
جو جنس بازار میں نایاب تھی ہمیشہ
وہ مجھ سے لے کے ادھار بالکل مکر گیا ہے
پڑوس میں تم نے جس کو زندہ جلا دیا تھا
سپاہی بن کے محاذ پہ بے خطر گیا ہے

ظفر اوگانوی کے یہاں جذبے کا خلوص اور احساس کی شدت ہے۔ بعض اشعار ایسے ہیں، جن میں فکروطن کا حسین امتزاج بھی ہے اور احساسات و تجربات کی کارفرمائی بھی۔ وہ رعایت لفظی سے بھی کام لیتے ہیں جس سے کلام میں معنویت اور دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ سامنے کی بات کو اپنے شعر کے قالب میں اس طرح ڈھالتے ہیں کہ اس میں معانی و مفاہیم کی تہیں کھل جاتی ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے جو موقع پرست ہوا کرتے ہیں اور جو اپنے مفاد کو ہی زندگی کی

اساس تصور کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ غنیمت ہے اب تک وہ مجھے پہچان پاتا ہے — ورنہ ایسے میں تو اپنے لوگ بھی انجان لگتے ہیں
ظفرؔ اس کے پیروں کو اللہ محفوظ رکھے — خطاؤں کی بیساکھیوں پر جو چلتا نہیں ہے

اور پھر اس طرح کے اشعار، جن میں ظفر اوگانوی کا اپنا رنگ و آہنگ ہے:

کبھی خوں بولتا تھا آستیں کا — مگر اب دستِ قاتل بولتے ہیں
وہ اپنے منہ سے کچھ کہتا کہاں ہے — فقط اس کے مسائل بولتے ہیں

ظفر اوگانوی کی عشقیہ شاعری بھی ان کی شاعری کا ایک حصہ ہے۔ ان کی شاعری میں یہ داستان رومانی دھندلکوں سے شروع ہوتی ہے اور پھر زندگی کی گونا گوں رنگینیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ وہ یادوں کی خوشبو سے اپنی بزم کو سجاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں والہانہ جذبوں کی سرشاری ہے۔ حقیقت کا ادراک ہے اور نایاب بصیرتوں کی کارفرمائی بھی۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

سب سے تم دل کی بات مت کہنا — پھیل کر شش جہات مت کہنا
دل کی چوکھٹ پہ کس طرح آئی — آنسوؤں کی برات مت کہنا
سبز پتوں پہ نام لکھنے سے — پا گئے تم نجات مت کہنا

اور محبت کے اس دل شکن تجربے کو دیکھئے، کس طرح شاعری کی زبان عطا کرتے ہیں:

تیرا صوفہ، ریشمی پردے اور رسالے، تیرا سلیقہ — تیری ویراں آنکھ مگر کچھ اور ہی کہتی میں نے دیکھی
کس نے دیکھا بھیگ گئی تھی، رات ظفرؔ صاحب کی آنکھیں
کھڑکی پٹ پر رات کی بارش شور مچاتی میں نے دیکھی

محبت کے خواب کی تعبیر کا ٹوٹ جانا ہی عاشق کا خواب ہوا کرتا ہے، جو ٹوٹ کر منتشر ہو جاتا ہے اور پھر ذہن میں دھندلی تصویریں محبوب کی اُبھرتی ہیں جس میں کچھ ربط معلوم نہیں ہوتا بلکہ وقت کے ہاتھوں رنگینیاں بھی مٹ جایا کرتی ہیں۔ زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور ماضی کا ہر تاثر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے:

جنگل جنگل پھیل گئی جو تیرے بدن کی بھینی خوشبو
اپنے در پر رات اندھیرے، دور سے آتی میں نے دیکھی
میں نے تجھ سے کون سی ایسی بات کہی تھی جس کی خاطر
شہر فصلیں آگ کی لپٹیں، اینٹ لہکتی میں نے دیکھی

تمہاری انجان مصلحت ہی کے سر گیا ہے
وہ حادثہ اک جو جاں پہ میری گزر گیا ہے

محبوب کی محبوبیت کا قائل ہونا اردو شاعری میں رسمی بات ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے ناز نخرے کو برداشت کرتا ہے لیکن اف تک نہیں کرتا۔ ذیل کے اشعار کو دیکھئے:

میرے انتشار خیالات کی داد دینا
تمہارے سوا اب کوئی یاد آتا نہیں ہے

کیوں ہتھیلی کی لکیریں تیری میری مشترک نکلیں
تیرے انداز و فا جب سے مجھے حیران لکھتے ہیں

اس کے چہرہ پر اچانک سرخ بادل کھیلتے دیکھے
آنے والے چند لمحے اک بڑا طوفان لکھتے ہیں

ظفر اوگانوی نے دنیا کے تجربات حاصل کئے تھے اور ان تجربات کی بھٹی میں تپ کر ہی رموز حیات و کائنات حاصل کیے تھے۔ یادوں کی بازیافت کا یہ سلسلہ موصوف کی شاعری میں داخل ہو کر کا احساس دلاتا ہے:

کتابوں کے انبار میں دب چکے ہیں کھلونے
ہے بچہ مگر کھیلنے کو مچلتا نہیں

یہ سچ ہے کہ ظفر اوگانوی نے شاعری بہت کم ہے لیکن انہوں نے جو کچھ کہا ہے اور محسوس کیا ہے، وہ کسی خاص رجحان یا تحریک سے وابستہ نہیں ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر طنز کرتے نہیں گھبراتے جو بیساکھیوں کا سہارا لے کر کامیابی کی منازل طے کرتے ہیں بلکہ ان کا خیال ہے کہ انسان کو محنت و مشقت کرتے رہنا چاہیے تاکہ اپنی منزل کو پاسکے۔ اسی لئے اس طرح کے اشعار کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا:

وہ جس سے کبھی راستے میں تعارف ہوا تھا
مرے ساتھ ایسا لگا اب کہ جاتا نہیں ہے

ظفرؔ اس کے پیروں کو اللہ محفوظ رکھے
خطابوں کی بیساکھیوں پر جو چلتا نہیں ہے

یہ غنیمت ہے کہ اب تک وہ مجھے پہچان پاتا ہے
ورنہ ایسے میں تو اپنے لوگ بھی انجام لگتے ہیں

ظفر اوگانوی اپنی ہنر مندی اور فن کاری سے تجربات کو نیا اور انوکھا بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے ادب کا قاری ایک نئے ماحول میں خود کو پاتا ہے۔ اس کے لئے وہ ترکیب سازی، علامت نگاری وغیرہ کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

دل ہے وہ لفظ جو معنی کو چھپائے رکھے
خود کو پتھر کبھی آئینہ بنائے رکھے

کل اندھیرے میں وہ گھر کھوج رہا تھا اپنا
اپنی چوکھٹ پہ دیئے جس نے جلائے رکھے

ظفر اوگانوی اپنی شاعری میں داخلیت پر زیادہ زور صرف کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آپ بیتی کہہ رہے ہیں اور یہی ان کی شاعری کے مطالعہ

سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آپ بیتی کہہ رہے ہیں اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیت ہے۔
ان کی شاعری میں بہ یک وقت کئی طرح کی کیفیات پائی جاتی ہیں:

جب سے شعلوں نے بنائی ہے گزرگاہوں پہ اپنی راہگذر
حوصلے پس پا ، ارادے مضمحل اور اب کہاں کا فاصلہ

ہم کو شعلوں میں ہر ایک بار سراپا جھلسے　　پھر بھی دامن کو بہر حال بچا ئے رکھے

ظفر اوگانوی فطری شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے اردگرد جس کرب ناک ماحول کو دیکھا اور محسوس کیا، اسے براہ راست اپنی شاعری کے وسیلے سے اظہار کیا ہے۔ انہوں نے جس شہر میں اپنی زندگی گزاری ہے، اس شہر کی سسکتی ہوئی زندگی کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے افسانے میں بھی کیا ہے اور انہیں باتوں کو شاعری کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے:

اب گلے میں پھانسی بن کر چبھ رہا ہے درمیاں کا فاصلہ
کون جانے کس طرح سے طے ہو ہمارے جسم وجاں کا فاصلہ
آسماں و دشت و دریا ، ساری دنیا کے سفر سے لوٹ کر
صرف طے کرنا بچا ہے اپنے اندر کے جہاں کا فاصلہ

ظفر اوگانوی کی غزلوں میں روز مرہ کی زندگی میں پیش آنے والے معمولی واقعات بھی خوبصورت سانچے میں نظر آتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہوتا ہے:

شہر میں تم اصول رہنے دو　　ہم سبھوں کو ملول رہنے دو
اونٹ بھوکا سفر سے لوٹے گا　　جنگلوں میں ببول رہنے دو
راستوں سے وہ کٹ چکا پھر بھی　　اس کے چہرہ پہ دھول رہنے دو

ظفر اوگانوی کی نظموں میں عشق اور وصل محبوب کے خواب آور تجربے اور اس کے بعد شکست خواب کی المناکی بھی ملتی ہے جس کا جذباتی اور حسیاتی منظر نامہ بھی ایک خاص لطف پیدا کرتا نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر شکست خواب کے المیے سے دو چار ہونے کے بعد نظم لکھ رہا ہے ۔ایک نظم 'سائے' ہے۔ اس نظم کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

تری آنکھ کا ایک بے ربط سادہ تسلسل　　گھنی چھاؤں میں جیسے لہرائے ڈرتا ہوا کوئی سایہ
مرے ساتھ بڑھتے ہوئے گھٹ گیا تھا　　مری زندگی کے بھیانک سفر میں کہیں کھو گیا تھا

ظفر اوگانوی کے یہاں مختصر اور طویل نظمیں بھی ملتی ہیں جو نثری فارم میں ہیں۔ ان کی

رومانی نظموں میں اداسی اور بے چینی کے جذبات کے اظہار ملتے ہیں۔اس طرح کی نظموں میں ان کی زبان حساس اور سکوت آمیز ہے۔نظم 'ایک نظم' کا یہ بند دیکھئے:

نیند لیکن کہاں آتی ہے
کب سے پلکوں کے در پہ کسی کا گذر ہی نہی
دور تک کوئی آہٹ نہی
یاس وحرماں کے اس عالمِ دشت میں
نیند آئی نہیں
جانے کون آ گیا؟
خواب بے خواب کا پیکر ماہ رو
جس کی بانہوں میں صد قمقمے جلتے بجھتے ہوئے
جس کی آنکھوں میں اک خواب کا سا سماں
جس کے ہونٹوں سے شہتوت کا رس ٹپکتا ہوا

ظفر اوگانوی کی شاعری اپنے ہموار لہجے، دھیمے پن، جذبوں اور احساسات کے توازن، زمانے کی سردمہری، بے راہ روی، فطری زندگی کو پھر سے پانے کی جستجو ہی ان کی شناخت ہے۔ان کی نظمیں اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں۔وہ واقعہ نگاری اور حسی کیفیات سے ایک انوکھی فضا تیار کرتے ہیں جو بالخصوص نثری نظم کے لئے سازگار ہیں۔نظم 'بے چارہ' میں دیکھئے کس طرح انہوں نے مذکورہ حقائق کو پیش کیا ہے:

ایک شام!
بیچ بازار میں وہ سر کے بل
وہ اچانک کھڑا ہو گیا
اک ذرا میں ہزاروں ہی لوگ
اپنی سنجیدہ مصروفیت چھوڑ کر
چائے خانوں، دکانوں سے خود کس گھسیٹے ہوئے
اور کتب خانے، ڈسپنسری
شام کے کالجوں
سیر وتفریح ودل بستگی کے لئے
دوڑنے بھاگنے والے قدموں کا رُخ موڑ کر
اپنے چہروں پہ سنجیدگی
رنج وکرب ولعب
انتہائی ذہانت کی بالیدگی
سرخوشی کی ردا ڈال کر
ایک مہمل عمل
دیکھنے اور دکھانے کھڑے ہو گئے

ظفر اوگانوی کی ایک مشہور نظم 'اجنبی' ہے جس میں تشنۂ تکمیل کا ایک تجربہ ہے۔یہ تجربہ یادوں کے آئینے میں صاف دکھائی دیتا ہے۔محبوب کی دلنواز شخصیت اور شاعر کا والہانہ جذبہ بہت ہی خوبصورتی سے تشکیل دیا گیا ہے۔محبوب کی کسک نے یادوں کے نگار خانے کے شاعر کو مکین بنا دیا ہے۔اس خوبصورت نظم کو پڑھئے اور محسوس کیجیے کہ شاعر نے کس طرح محبوب کو مخاطب کیا ہے:

تمہیں مجھ سے اب بھی شکایت یہی ہے
کہ میں اب تلک اجنبی اجنبی سا تمہیں لگ رہا ہوں

تمہاری شکایت بجا ہے
کہ تم تو ابھی تک وہی ہو
تمہارے خد و خال کے سرخ ڈوروں میں اب بھی
کئی چاند سورج الجھنے کو بیتاب سے ہو رہے ہیں
تمہاری شکایت بجا ہے
کہ تم تو ابھی تک وہی ہو
کہ اب بھی
تم آواز کے گھنگروؤں سے قیامت جگانے کا فن جانتی ہو
تمہاری شکایت بجا ہے
کہ میں اپنی آواز کو
خود ہی
کچھ دور سے کوہساروں سے آتے ہوئے سن رہا ہوں
تمہاری شکایت بجا ہے
کہ اب بھی تمہارے لئے آئینے چشم وا ہیں
مگر
میرے سب آئینے دھند میں کھو گئے ہیں
تمہیں اب کہو یہ
کہ میں اجنبی اجنبی سا کیوں لگ رہا ہوں؟؟

ظفر اوگانوی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن نظموں کی تعداد، غزلوں سے زیادہ ہے۔ نثری نظم سے شوق رکھتے تھے۔ وہ اپنے مسائل، دنیا کی بے ثباتی، دنیا کی رعنائیوں ان سبھوں کا ذکر انہوں نے اپنی نثری نظموں میں بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا، دور دور تک امید نام کی کوئی چیز نہیں تھی، چھوٹی چھوٹی نوکری کے لئے درخواست دینا معمول بن چکا تھا۔ انہیں حالات کے پیش نظر انہوں نے ایک نظم 'اپنی بے روزگاری کی پہلی سالگرہ' (۳؍مارچ ۱۹۶۸ء) کے عنوان سے کہی ہے۔ دیکھئے کس طرح انہوں نے سارے مسائل کو نظم کی زبان دے کر پیش کیا ہے:

آج کا روز میرے لئے اجنبی تو نہیں
آج تو جشن کا روز ہے
آج تو جشن کا روز ہے
آج ہی میرا میں
وقت کے لامکاں میں جو مدت ہوئی
کھو گیا تھا کہیں
اور اسکی جدائی کا غم بھولنے کیلئے
انجمن، انجمن
مے کدے، مے کدے
سالہا سال کا اک نچوڑا لہو
پی کے بدمست و مدہوش تھا
مدرسے اور دانش کدے
علم و فن
بے تکے لفظ، معنی کفن
پہن کر آپ کے شہر میں آ گیا
پھر — کتابوں کے تابوت میں
چند بوسیدہ لاشوں سے رستی ہوئی گندگی
گندگی چاٹتا رہ گیا

رہ گئیں ڈگریاں
کج کلاہان الفاظ کا بانکپن
ایک بازار کا شور وغل
لے کے ہاتھوں میں اک کاسۂ حسن ظن

بھیک دے دے
کوئی بول ہی بخش دے
پھر بھی مفہوم کے دل کو کوئی نہیں چھو سکا
پھر بھی کوئی نہیں آ سکا
مگر
وہ اچانک دبے پاؤں آ ہی گیا
ڈگریوں کا کفن
جل گیا کاسۂ حسنِ ظن
جل گیا کاسۂ حسنِ ظن
مصلحت کے دریچوں سے چھنتی ہوئی روشنی
کج کلاہان الفاظ کی گردنیں جھک گئیں
رسم آرائش انجمن
مجھ کو جیسے مری زندگی مل گئی

کاغذی پیرہن
مسندوں پر رکھے ٹیپ ریکارڈر
میں جہاں
مانگتا پھر رہا تھا کہ اپنائیت کی کوئی
پیار و محبت، خلوص و وفا کا
لفظ ہی بخش دے
میری آواز کے سائبان منتظر ہی رہے
اور نہ میرا میں ہی مجھے مل سکا تھا
آج کے روز پچھلے برس
مجھ کو جیسے مری زندگی مل گئی
کاغذی پیرہن جل گئے
دانش و آگہی اور ذہانت کی بازی گری
دانش و آگہی اور ذہانت کی بازی گری
خود بخود بجھ گئی
جھک گیا آسماں
مسکراتی ہوئی اک چبھن بن گئی
آج تو جشن کا روز ہے!

آج کا روز میرے لئے اجنبی تو نہیں

بے روزگاری کے بعد جب زندگی نے کروٹ لی تو کلکتہ یونیورسٹی میں ترقی پسند شاعر اور قدآور شخصیت پروفیسر پرویز شاہدی کے انتقال کے بعد جگہ نکلی جس کے لئے ظفر اوگانوی نے درخواست دے رکھی تھی۔ اتفاق سے موصوف کا انتخاب بہ حیثیت لیکچرر ہو گیا لیکن جوں ہی کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بہ حیثیت استاد جوائن کیا، ان کے خلاف ایک محاذ کھڑا ہو گیا۔ چونکہ موصوف بے باک تھے اور اپنی صلاحیت سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنا جانتے تھے، لہٰذا اس محاذ کا اثر انہوں نے اس طرح لیا اور نظم 'سازش' (دیار وحشت کے لئے) لکھ ڈالی جو ہفتہ وار 'اجالا' کلکتہ، ۱۱/ مئی ۱۹۶۹ء کو شائع ہوئی:

سازشیں یوں تو بہت آپ نے دیکھی ہوں گی
رہزنیِ رختِ سفر
خود نہ گر دیکھ سکے ہوں تو سنا ہی ہوگا
پرِ پروانۂ بسمل
شعلہ نظر کی سازش
کوئی سایہ پسِ چلمن
تیرگی ذہن ونظر
اس طرح کوئی سازش نہ مگر آپ نے دیکھی ہوگی
انجمن یار میں اب
ہو گئے کورِ نظر

قتل دل دار نظر
درد جگر کی سازش
کس طرح دامن زر دل
ہو گئے شعلہ نگر
شب تاریک، گلی سے تو کبھی آپ بھی گزرے ہوں گے
کئی بانہیں اور کئی تن
راہ گزر کی سازش!
بزم دل دار میں اب
اہل ہنر
تنگ جگر کی سازش

سازشیں یوں تو بہت آپ نے دیکھی ہوں گی!

ایک نظم 'مشترکہ خودکشی' کے عنوان سے ہے جس میں انہوں نے So-Called Intellectuals پر طنز کیا ہے۔ اسی طرح کی بات انہوں نے اپنے مشہور افسانہ 'زہر' میں بھی کی ہے۔ دراصل ادبی دنیا، ایسے لوگوں سے اٹی پڑی ہے جو اندر سے خالی ہوتے ہیں اور ظاہری شان و شوکت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ان جیسا کوئی ادیب وشاعر ہی نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے ایک نظم 'مشترکہ خودکشی' کے عنوان سے ہے:

رات اپنا لہو پی کے کچھ اس طرح ناچتی رہ گئی
محفلوں پر سماں بندھ گیا
تیرگی میں ہواؤں کے جھومر لٹکتے رہے
میز پر چائے کی اک پیالی میں

وقت نے ایک کروٹ جو لی
شبنمی آنکھ سے ایک سورج گرا
پیار سے ہم تجھے دیکھتے رہ گئے
کچھ لوگ ہنستے ہوئے گر پڑے

خودکشی کا بڑا مسئلہ حل ہوا!!

نئی صدی کی آمد کی تیاریاں تو برسوں سے کی جارہی تھیں۔ ہر علاقے کو خوشنما بنانے کی ہر ممکن کوششیں جاری تھیں۔ ہر ملک اس نئی صدی کا انتظار کر رہا تھا۔ اکیسویں صدی کتنوں کے لئے خوشی کا پیغام لے کر آئی تو کتنوں کے لئے ماتم۔ ظفر اوگانوی ایک حساس دل رکھتے تھے۔ انہوں نے جس بات کو شدت سے محسوس کیا، اسے نظم کی صورت میں پیش کیا۔ وہ اپنی نظم 'اکیسویں صدی' کے عنوان

سے لکھتے ہیں کہ:

ہوا یہی تھا
کڑی دھوپ میں مچھلیوں کی مانند سکھا دیے تھے
تمام غنچوں کی لہلہاہٹ
خلوص و چاہت
نئی صدی کے مہیب جنگل میں
کہ شہر، گاؤں کی عورتوں نے
کہ پھر کوئی بانسری کی دھن پر
سفید کلیوں کی مسکراہٹ
ریاضتوں کی عظیم جنت
دفن کرنے کو جا چکا تھا

بہر حال ظفر اوگانوی کی غزلوں اور نظموں کے حوالے سے موصوف کو بہ حیثیت شاعر پیش کرتے ہوئے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ انہوں نے غزلیں اور نظمیں بہت کم لکھی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہ حیثیت مجموعی ظفر اوگانوی اوسط درجہ کے شاعر ہیں کیونکہ انہوں نے شاعری کو ذریعہ اظہار نہیں بنایا۔ اگر انہوں نے شاعری کو مستقل فن بنایا ہوتا تو یقیناً وہ اردو ادب کو اچھے شعر دیتے اور اردو ادب کی دنیا میں ایک اور طرح دار شاعر کا اضافہ ہوتا۔

☆☆☆

جون 2023 قیمت 15 ₹

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

उर्दू दुनिया, मासिक, जून-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०६
URDU DUNIYA Monthly, June-2023, Vol.25, Issue:06
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2023-25
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/05/2023
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6

پانچواں باب آثار و علائم کے نام سے ہے۔ اس باب میں برہانپور کی مسجد کلاں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ہے جسے نصیر خاں فاروقی نے 1402ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

چھٹے باب میں شاہی جامع مسجد برہانپور کی مکمل تاریخ اور حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی تعمیر صدر دروازہ، صحن، سفیدی مائل سیاہ پتھر کا مسجد تعمیر میں استعمال، اندرونی حصے میں چمکدار سیاہ پتھر سے مسجد کی محرابیں، چھت کی اندرونی خوشنما تعمیر اور نقاشی وغیرہ کو بڑے سلیس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

ساتویں باب میں مغل دور کے امرا، سپہ سالار اور صوبے داروں کے حالات کا ذکر ہے جن کا قیام برہانپور میں رہا۔ ان کی دینی تصانیف کا اثر ملک کے دوسرے حصوں پر بھی پڑا۔ انھی شخصیات میں عبدالرحیم خانخاناں ابن بیرم خاں تھے، شاعری ادب اور فوجی صلاحیت کے مالک تھے، عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی زبانوں کے ساتھ ساتھ پوربی زبانیں بھی جانتے تھے۔ ان کی سب سے اہم کتاب مآثر رحیمی ہے۔

آٹھواں باب آصف جاہی دور حکومت سے متعلق ہے۔ نواب آصف جاہ اول یعنی حیدرآباد کے نظام سے شروع ہو کر نواب احمد علی خاں ناصر جنگ، نواب آصف جاہ ثانی، نواب آصف جاہ سوم، نواب آصف جاہ چہارم، نواب آصف جاہ پنجم، نواب آصف جاہ ششم اور نواب آصف جاہ ہفتم پر مشتمل ہے۔

نویں باب میں مرہٹہ پیشوا اور سندھیا کے دور حکومت، مرہٹہ دور کے علما و صوفیائے کرام، مشہور مزار، گرودواروں، جین مندر، دیگر جین مندر، گرودوارہ بڑی سنگت، درگاہ حکیمی، مسجد دائی انگہ، مسجد سکندر شاہی، مسجد شاہباز خاں، ہندوستانی مسجد اور تارا مسجد سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

دسویں باب میں انگریزی دور حکومت میں برہانپور میں پانی کی سپلائی کا نظام برہانپور ممبئی ریلوے لائن، تاپتی مل کا قیام، رابرٹ سن اسکول کا قیام، 1948 میں سیماس ہائی اسکول کا نام دیا گیا، بوہرہ برادری کے دو اسکول قادریہ جسے ہائی اسکول اور حکیمیہ ہائی اسکول کا قیام، ممبر آف پارلیمنٹ عبدالقادر صدیقی، گنگا چرن دکشت، پرمانند جی گوئندوالا، ڈاکٹر فیروزہ علی، سیٹھ محمد ہارون سوت مل، شکر کارخانہ، پاورلوم، صنعت، بیڑی صنعت، قادریہ کالج، جامعہ اشرفیہ اظہار العلوم، مدرسہ فیض العلوم، جامعۃ الطاہرات، دارالعلوم شیخ علی متقی، گورنمنٹ آیورویدک کالج، سیفیہ حمیدیہ یونانی کالج، سیوا سدن کالج اور گورنمنٹ گرلس پولی ٹیکنک کالج کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

گیارہواں باب علمی و ادبی گوشہ ہے۔ برہانپور میں جنھوں نے تحقیق و تصنیف نظم ونثر کے ذریعے شہرت حاصل کی، ان کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان نامور ان شہر کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب علمی اور ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی اور پڑھی جائے گی۔

ترتیب

ظفر اوگانوی بیج کا ورق کے تناظر میں

مرتب: دبیر احمد

صفحات: 344، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: مدینہ پبلی کیشنز، 44 بی، کارل مارکس سرانی، کولکاتا۔ 700023

مبصر: محمد منظر حسین، اسسٹنٹ پروفیسر، پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، کولکاتا۔ 700013 (مغربی بنگال)

ظفر اوگانوی کا شمار جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، تنقید نگار، محقق، شاعر اور ہر دل عزیز استاد تھے۔ جدیدیت کے بانی شمس الرحمن فاروقی نے جدیدیت کا نظریہ قارئین تک پہنچانے کے لیے رسالہ 'شب خون' جاری کیا۔ اس رسالہ میں کسی کی تخلیق شائع ہونا باعث افتخار سمجھا جاتا تھا اور یہ افتخار ظفر اوگانوی کو بھی حاصل تھا۔ کیونکہ اس رسالے میں ان کی تخلیقات پابندی سے شائع ہوتی تھیں۔ اسی سے ان کے جدیدی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کبھی بھی تعداد کو اپنی کامیابی کا ضامن بننے نہیں دیا بلکہ ہمیشہ 'تعداد' سے زیادہ 'معیار' پر توجہ دی۔ اس تعلق سے وہ خود لکھتے ہیں:

''جہاں تک تعداد کا تعلق ہے، میں نے... اس حد تک کم لکھا ہے کہ بعض ناقدین مجھے افسانہ نگار ماننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔ مگر میں کہ خود شناسی کا قائل ہوں، اس لیے سمجھتا ہوں کہ میں [نے] اگرچہ بہت کم لکھا ہے لیکن دوسرے بسیار نویس معاصر افسانہ نگاروں سے بہت اچھا لکھا ہے۔'' (ظفر اوگانوی بیج کا ورق کے تناظر میں، ص 10)

جدیدیت سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں علامتوں کا خوب استعمال کیا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ لوگ علامت نگاری کے نام پر غیر معیاری چیزیں بھی ادب میں پیش کرنے لگے، جس کی وجہ سے جدیدیت کی مخالفت بھی ہونے لگی لیکن ظفر اوگانوی نے معیار کا پورا خیال رکھا۔ انھوں نے علامت کے نام پر کبھی بھی ادب سے کھلواڑ نہیں کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کا صرف ایک ہی افسانوی مجموعہ 'بیج کا ورق' ہے، جو کہ کل گیارہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان افسانوں میں جس طرح کی علامتوں کا استعمال تخلیق کار نے کیا ہے وہ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ یہ علامتی افسانے انھیں کی سمجھ میں آسکتے ہیں، جو ادب کے غواص ہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت 1977 میں کلکتہ سے ہوئی۔

'بیج کا ورق' میں شامل افسانوں کی مشکل پسندی کو دیکھتے ہوئے دبیر احمد نے ماہرین ادب سے ان افسانوں کا تجزیہ کروا کر کے انھیں افسانوں کے ساتھ شائع کر کے قارئین کے لیے آسانی فراہم کر دی ہے۔ گرچہ یہ تجزیے حرف آخر نہیں ہیں، ان میں مزید وسعت کی گنجائش ہے۔ مرتب نے افسانوں کے تجزیے کے لیے اہم لوگوں کا انتخاب کیا ہے جن میں سے بعض نے معذرت کر لی کیونکہ ظفر صاحب کا افسانہ بہت سے لوگوں کی پہنچ سے باہر ہے۔ اس تعلق سے دبیر احمد 'حرف نسبت' میں لکھتے ہیں:

''ظفر اوگانوی کا افسانوی مجموعہ 'بیج کا ورق' میں شامل افسانوں کے تجزیے میں میری پوری کوشش رہی کہ ان اصحاب قلم کے مضامین شامل ہوں، جنھوں نے اردو ادب نیز 'جدیدیت' کو سمجھا ہے۔ مجھے شدید حیرت اس وقت ہوئی، جب بعض افراد نے تجزیہ نہ کرنے کے مختلف جواز فراہم کیے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ظفر اوگانوی کے افسانوں کو سمجھ ہی نہ سکے یا سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ آج بھی بعض حضرات ایسے ہیں، جو غالب اور اقبال کو سمجھنے سے قاصر ہیں، تو اس میں بھلا غالب اور اقبال کا کیا قصور ؟۔'' (ظفر اوگانوی بیج کا ورق کے تناظر میں، ص 74)

اس کتاب میں بھی افسانوں کے تجزیے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چھ افسانوں کے تجزیے دو دو لوگوں نے کیے ہیں۔ چار افسانوں کے تجزیے تین تین لوگوں نے کیے ہیں، جب کہ صرف ایک افسانہ 'ریس کے گھوڑے' کا تجزیہ چار لوگوں نے کیا ہے۔ ان تجزیہ نگاروں میں سبھی نام قابل احترام ہیں بلکہ سبھی اردو ادب کے ماہ و انجم ہیں۔ ان میں تخلیق کار بھی ہیں اور تنقید نگار بھی۔ تجزیہ کرنے والوں کا تعلق ترقی پسندی سے بھی ہے اور جدیدیت سے بھی۔ ان تجزیہ نگاروں میں شارب ردولوی، اشفع ظفر، انیس اشفاق، شافع قدوائی، ابوالکلام قاسمی، علی احمد فاطمی، قدوس جاوید، بیگ احساس، حسین الحق، طارق چھتاری، صغیر افراہیم، جمیل اختر محبی، خالد جاوید، انیس رفیع، کوثر مظہری وغیرہ اہم نام ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بہترین ادب وہ ہے جو سو سال کے بعد بھی باقی رہے۔ ظفر اوگانوی کے افسانوی مجموعے 'بیج کا ورق' کی اشاعت کو نصف صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، مگر اس کے باوجود آج بھی اس میں وہی تر و تازگی ہے۔ ان افسانوں کا

[illegible]

فکشن

تماشائے اہلِ کرم

مصنف: شکیل اطہر

صفحات: 220، قیمت: 400 روپے، سن اشاعت: 2022

مطبع: [illegible]

مبصر: [illegible]

[illegible]